نظامِ اردو

سید انور حسین آرزو

اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

سلسلۂ مطبوعات نمبر ۲۳

نظامِ اُردو

سید انور حسین آرزو

مع حواشی

سید مسعود حسن رضوی ادیب

اتر پردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ

نظامِ اردو

سید انور حسین آرزو

NIZAM-E-URDU
Anwar Hussain Arzoo

پہلا فوٹو آفسیٹ ایڈیشن ۱۹۷۹ء
قیمت: ۳ روپے ۱۵ پیسے

غلام حسین زیدی، سکریٹری اتر پردیش اردو اکاڈمی نے میسرس جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرس
جامع مسجد دہلی ۶ سے چھپوا کر اکاڈمی کے دفتر بہرہ باؤس، قیصر باغ لکھنؤ سے شائع کی۔

آرزو لکھنوی کی نظر زبان و بیان، قواعد و عروض پر بہت گہری تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ میر ضامن علی جلال لکھنوی کا ورثہ انھیں ملا تھا اور جلال "سرمایۂ زبان اردو" جیسی لغت کے مصنف تھے۔ آرزو لکھنوی نے زبان کے اصول و قواعد کو مدون کرنے کی بڑی کامیاب کوششیں کی ہیں "نظام اردو" اسی کی شاندار مثال ہے۔ اب تک ہوتا آیا ہے کہ قواعد داں عام طور پر یا تو اردو قواعد کو فارسی قواعد کے سانچے میں ڈھالتے ہیں یا پھر انگریزی قواعد کو معیار مان لیتے ہیں جب کہ اردو کو اردو قواعد کی ضرورت ہے اور اس کا مزاج فارسی اور انگریزی دونوں سے الگ ہے۔ آرزو لکھنوی چونکہ سلیس اور ٹھیٹھ اردو کے رسیا تھے اس لیے انہوں نے "نظام اردو" میں بھی یہی اسلوب و انداز برتا ہے جو ان کی امتیازی خصوصیت ہے۔

ایک مدت سے آرزو لکھنوی کی تصانیف نایاب تھیں اتر پردیش اردو اکاڈمی فخر کے ساتھ ان کی تین تصانیف۔ "سریلی بانسری"، "جہان آرزو" اور "نظام اردو" فوٹو آفسیٹ کے ذریعے پیش کرتی ہے۔ امید ہے کہ ان تصانیف کے دوبارہ مہیا ہو جانے سے اردو داں طبقہ فیض یاب ہوگا۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی،
لکھنؤ
۲۳ فروری ۱۹۷۹ء

محمد حسن
چیرمین مجلس انتظامیہ

دیباچہ

آرزو لکھنوی اردو کے نامور شاعر، زبان داں اور علم بیان و بدیع کے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں، بلاشبہ انہوں نے زبان و ادب کی نہایت اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اردو کو عام بول چال کی زبان ہونے کا دعویٰ مدتوں سے ہے لیکن اس دعوی کو اس خوبی سے نظیر اکبر آبادی اور انشاء اللہ خاں انشا کے بعد کلام آرزو سے بڑی کوئی دلیل نہیں ملی۔ آرزو نے اس شائستہ، شستہ اور سادہ زبان میں شاعری کی جسے صحیح معنوں میں ہندوستانی کہا جا سکتا ہے اور جو عملاً ہندوستان کی عوامی زبان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاعری عام بول چال کی زبان میں ممکن نہیں کیونکہ خیال کی گہرائی اور کیفیت کی باز آفرینی سیدھی سادی روزمرہ کی زبان سے بلند تر پیرایۂ بیان کا مطالبہ کرتی ہے۔ آرزو لکھنوی کی شاعری اس کے برخلاف شعر کی لطافتوں اور نزاکتوں کو گھلاوٹ، شیرینی اور سادگی کے ساتھ اس طرح سموتی ہے کہ مغلق زبان کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اسی لیے سہل ممتنع کو شاعری کا اعلیٰ ترین معیار سمجھا جاتا رہا ہے۔

امتنان

میں منت پذیر ہوں عالی جناب سید اعزاز رسول صاحب زیدی الہاشمی رئیس اعظم سندیلہ کا کہ آپ نے اس کتاب کی پہلی طباعت کے کل مصارف بغیر کسی تحریک کے اپنی جیب خاص سے عنایت فرما کر اپنی علم دوستی اور قدر شناسی کا ثبوت دیا۔

انور حسین آرزو موسوی
لکھنوی

نمبر شمار	فہرست مضامین	صفحہ

فہرست مضامین

دیباچہ

از مصنف

حق ثنا ادا ہو کیا زباں سے اُسکی ذات کا — کہ جس کا لاک اشارہ ہے نظارہ کائنات کا

ہیں ایک سب ہستیاں اگرچہ ایک ہی نہیں — نگار حسن پردہ در کہ دو میں بھی دوئی نہیں

ظہور نور خاص ہے ظہور ذات مصطفےٰ — شعاع مہر کی طرح کہ باہم اور پھر جدا

اس آئینہ میں جلوہ گر وہ نور لاجواب ہے — جمال ماہ سے عیاں جلال آفتاب ہے

علی ہیں نفس مصطفےٰ یہ دونوں یعنی ایک ہیں — ہیں مختلف یہ لفظ دو کہ جنکے معنی ایک ہیں

نبی نہال باغ حق تو اہل بیت پھول ہیں — اسی شجر کے برگ تر صحابی رسول ہیں

وہ برگ اب کہاں ہے جو گل سے فیض پا گئے
مہک اُٹھے جہاں کہیں مشام جاں بسا گئے

یہ مختصر رسالہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں اُردو زبان کے اجزائے ترکیبی کی تشریح و تقسیم کے بعد حدود زبان بیان ہوئے ہیں جس سے اُردو کا ایک اصولی اور مستقل زبان ہونا واضح ہوتا ہے۔ دوسرے حصہ میں استعمال الفاظ کیلیے وہ اصول وضع کیے گئے ہیں جن کے زیر اثر تمام الفاظ کے لیے عموماً اور مترادفات کے لیے خصوصاً محل استعمال مقرر ہو گئے ہیں۔

اس موضوع پر کوئی کتاب باوجود تلاش مجھے دستیاب نہ ہوئی۔ اس لیے مصطلحات ضروری بھی خود ہی معین کیے اور علم بلاغت کے اس نئے شعبہ کا نیا نام "علم تنقیح کلمات" بھی خود ہی تجویز کیا۔ اور کتاب کو اردو کے سب سے بڑے

سرپرست اعلیٰ حضرت ہز اگزالٹڈ ہائینس میر عثمان علی خاں بہادر

بالقابہ شہریار دکن خلد اللہ ملکہ کی طرف نسبت دے کر "نظام اردو" کے نام سے موسوم کر دیا۔ ارباب بصیرت اگر کہیں غلطی پائیں تو اصلاح فرمائیں کہ انسان کے نسیان و خطا کا ہونا ممکن نہیں بلکہ نہ ہونا ناممکن ہے۔

کتاب کے دونوں حصوں کے اسباب تصنیف مختلف ہیں۔ پہلے حصہ کی تصنیف کا سبب وہ دقتیں ہیں جو اکثر مسائل کے حل میں پیش آیا کرتی تھیں۔ کیونکہ زیر بحث مباحث میں زبان دانوں کے مسلک جداگانہ تھے۔ بلکہ کہیں کہیں تو ایک ہی شخص کے مختلف اقوال میں تناقض نظر آتا تھا۔ دلائل یا تو تھے ہی نہیں سائل کو ہر حکم کے سامنے عقیدتمندی کے ساتھ سر تسلیم خم کر دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اور جو دلائل تھے وہ متضاد۔ ایک ہی طرح کی دو لفظوں میں ایک جگہ دلیل صحت اصل لغت قرار دیا جاتا تھا تو دوسری جگہ استعمال فصحا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ نہ زبان کے حدود معین تھے نہ فصاحت کے اصول۔ تمنا تھی کہ اجزائے زبان کی تحقیق ہو، استعمال الفاظ کے لیے اصول معین ہوں کہ غلط و صحیح، فصیح و غیر فصیح کیلیے کوئی معیار قائم ہو سکے۔ مگر یہ ہوتا تو کیونکر ہوتا نہ اپنے میں صلاحیت کا یقین نہ کوئی دوسری قابل اعتماد ہستی اس ضروری کام کی طرف متوجہ

اسی الجھن کے زمانہ میں لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی سے شرف نیاز مندی حاصل ہوا۔ انکی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ مرحوم کی دور بیں نگاہ آئندہ کے خطرے محسوس کر رہی تھی۔ تبادلۂ خیالات کے بعد انھوں نے مجھی کو اس کام کے لیے مجبور کیا جو میری حیثیت سے بالاتر تھا۔

یہ ایسا وقت تھا کہ حضرت استاد باکمال حکیم میر ضامن علی صاحب جلال انتقال فرما چکے تھے۔ اساتذۂ عصر کی متفقہ رائے اور خواجہ تاشوں کے متعدد تصفیہ سے میں ان کا قائم مقام قرار دیا جا چکا تھا۔ اب ذمہ داریاں اور بڑھیں۔ استفسارات کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا جن میں زبان کا معاملہ سب سے اہم تھا۔ سمجھنے کیلیے اپنے ذوق کے سوا کوئی سہارا نہ تھا۔ اور سمجھانا ضروری تھا۔ بہرحال جو سمجھ میں آیا سمجھایا معلوم نہیں کہ خود بھی صحیح سمجھا یا نہیں۔

دوسرے حصہ کی تصنیف کا سبب وہ دقت تھی جو استعمال مترادفات کے وقت پیش آیا کرتی تھی۔ یہاں بھی ہر شخص کا ذوق اسکا رہنما تھا اور اتحاد مذاق محال، بلکہ خود ذوق کا ایک حالت پر باقی رہنا دشوار۔ یہی وجہ تھی کہ ایک ہی شخص کے فیصلے متضاد ہوا کرتے تھے۔ مترادفات کے لیے نہ کوئی فرق امتیازی مقرر تھا نہ محل صرف۔ حسب اتفاق ایک دن **موازنۂ انیس و دبیر** مولفہ علامہ شبلی نعمانی نظر سے گزری اور فصاحت کلام کے بیان میں مترادفات کی بحث استعمال سامنے آئی۔ علامہ مرحوم نے فصاحت کی بنیاد اصوات حروف کی باہمی مناسبت کو قرار دیا ہے۔ یہ بھی ایک حد تک درست ہے۔ مگر نہ یہ کوئی واضح اصول ہے نہ تمام مترادفات اس کے تحت میں آتے ہیں۔ لفظ کے ترک و اختیار

کا فیصلہ پھر بھی ذوقِ فطری پر چھوڑتا ہے۔ میں نے کتاب بند کر دی اور زیرِ بحث مثالوں کو سامنے رکھ کر غور کرنے لگا۔

(۱) کھا کھا کے اُوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

(۲) شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

کچھ دیر بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ اُوس کی جگہ شبنم اس لیے غیر فصیح معلوم ہوتا ہے کہ اُوس کھانا محاورہ ہے اور محاورہ میں ردّ و بدل درست نہیں کہ استعمال لفظ کی یہ سماعی صورتیں مقررہ ہیں۔ لیکن شبنم کی جگہ اُوس کھپ سکتا ہے مثلاً مصرع ثانی کو یوں پڑھیں "تھے اُوس سے بھرے ہوئے ساغر گلاب کے" یا "چھلکا رہی تھی اُوس کٹورے گلاب کے" تو کسی طرح غیر فصیح نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ شبنم کا استعمال قیاسی ہے جس سے وہ اپنے مترادف سے بدل سکتا ہے۔ یہیں سے استعمال لفظ کے دو بنیادی اصُول قائم ہو گئے۔ بظاہر سماعیات کی بحث اک عقدہ لاینحل نظر آتی تھی مگر ایک خاص نکتہ ذہن میں آجانے سے وہ توقع خلافِ اُمید جلد تمام ہو گئی۔ لیکن قیاسیات کی بحث کا مکمل ہونا اجزائے زبان کی ماہیت اور ساخت زبان کی حقیقت کو سمجھے بغیر محال تھا۔ اسلیے یہ بحث جانکاہ کاوشوں اور بے بہا قربانیوں کے ساتھ مدت مدید میں انجام کو پہونچی۔ کیونکہ تنہا یہی کام نہ تھا۔ مقصودِ اصلی تو شاعری تھی جس کا ایک لازمہ اصُول زبان کی واقفیت بھی ہے۔ غزل گوئی کے بغیر تو شاعری کی دُنیا میں رہنا ہی دشوار تھا۔ طولانی مرثیے، بسیط ڈرامے، لاانتہا داستانیں لکھیں، ان کے علاوہ سلام رباعی، تاریخ، تخمیس، مثنوی غرضکہ اصنافِ سُخن میں سے تقریباً ہر صنف میں

کبھی اپنے شوق سے کبھی احباب کی خاطر سے کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا تھا۔ ہر قسم کے کلام کی اصلاح اس پر مستزاد تھی۔ پھر بھی ایک مختصر سی تصنیف کے لیے بیش بائیس "برس" کا زمانہ بظاہر بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے مگر موضوعِ کتاب کی جدت، اہمیت، اپنی ناقابلیت اور کاموں کی کثرت کے ساتھ زمانہ کی ناساعدت کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہے۔ ایک نئی زبان کی وضع و ساخت کو سمجھنا، فطرت کے معین کیے ہوئے اصُول کو تلاش کر کے علم کی صورت میں ترتیب دینا، فصاحت کلام کیلیے اصُول وضع کرنا لقمان کی عقل اور اطمینان کی زندگی چاہتا تھا نہ کہ مجھ سا ہیچمداں جس کا علم لاعلمی جس کا اطمینان بے اطمینانی، مگر کارساز تو کوئی اور ہی ہے۔ اس کتاب سے میری ذات کو وہی نسبت ہے جو ایک ناقص تخم کو اُس ہرے بھرے درخت سے ہو سکتی ہے جو اُس تخم سے پیدا ہو گیا ہو ؎

شکر اُسی کا جس نے قطرہ سے گہر پیدا کیا

دانۂ ناقص سے نخل بار ور پیدا کیا

یہ بھی عجیب اتفاق ہوا کہ کتاب شروع کرتے ہی مصیبتوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا پہلے خود ہی مسترخی ہوا، سوا اعضائے رئیسہ کے تمام اعضا ماؤف ہو گئے۔ معطل جسم میں ٹھٹھکے ہوئے خون کی روانی گویا دوسری زندگی کا آغاز تھا، کیونکہ آواز کا لحن، تحریر کی شان، غرضکہ زندگی کی اکثر علامتوں میں فرق ہو گیا۔ ممکن ہے کہ یہ نئی زندگی انھیں کاموں کے لیے ملی ہو جو بعد میں انجام کو پہونچے۔ اب کتاب تو ختم ہو گئی۔ زندگی کا حال خدا جانے، بہرحال اگر موت نے مہلت اور زمانے نے موقع دیا تو چند ایسے ہی کام اور بھی نظر میں ہیں جو نہایت ضروری ہیں مگر

ان کی طرف بھی کسی کو توجہ نہیں۔

الحاصل مصیبتوں کا سلسلہ تصنیف کے ساتھ ساتھ جاری رہا۔ لڑکوں میں سے صرف دو بچے، آٹھ ضائع ہو گئے جن میں ایک لڑکی کی موت نے بال سپید کر دیے اور ایک لڑکے کے مرنے نے بصارت کو نقصان پہونچایا، خانہ ویرانی کی مصیبت نے تو کسی کام ہی کا نہ رکھا۔ تنہائی کی حالت میں چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش نیز سامان زندگی کی فراہمی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کام قلت معاش کا سبب اور قلت معاش کام میں حارج، دماغ پر ضعف آیا، دل میں الجھن اور گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔ جب آلات کار بیکار ہوں تو کام کس طرح بنے اب یہ نوبت ہوئی کہ کبھی صحیح کو غلط کر دیا کبھی پھر غلط کو صحیح کیا، مگر تکمیل کار کے جنون میں کمی نہ ہوئی آخر کام بھی ختم ہوا اور ایک مفید سبق بھی حاصل ہوا کہ اگر خدا پر بھروسہ رکھے اور استقلال میں فرق نہ آنے دے تو جو چاہے ہو جائے۔

ناشکری ہوگی اگر کہوں کہ دنیا قدر شناسوں سے خالی ہے۔ اس کسمپرسی کے زمانہ میں بھی میری طلب تین درباروں سے ہوئی۔ نواب امراؤ بہادر صاحب کبیر رئیس باندہ کی وساطت سے رامپور بلایا گیا اور حاجی جلیل الدین صاحب سندیلوی مہاراجہ صاحب بلاداٹہ کے حکم سے خود میرے لینے کو تشریف لائے۔ نواب احسان علی بہادر صاحب احسان نے مہاراجہ صاحب اندور کے ایما سے اپنے چھوٹے بھائی صاحبزادہ سیف علی بہادر صاحب کو میرے لینے کے لیے بھیجا۔ یہ ایسا نازک وقت تھا کہ منشی سید التفات رسول صاحب شیخ تعلقدار جلال پور رئیس سندیلہ جو میرے کفیل حال ہوا کرتے تھے انتقال فرما چکے تھے۔ مگر میں نے خدا پر توکل کر کے

ہر جگہ جانے سے انکار کر دیا، اسلیے کہ ایک تو مجھ میں درباداری کی صلاحیت نہ تھی دوسرے ایک ایک مسئلہ کے حل کرنے میں ہفتہ ہفتہ بھر الجھے رہنا بغیر کامل آزادی کے ممکن نہ تھا۔ متعلقین نے ضیق کی زندگی گزاری۔ انکی واجب ضرورتیں اور جائز خواہشیں میری مجنونانہ مصروفیتوں پر قربان ہوتی رہیں۔ آج میری خوشی بھی لاثانی ہے کہ اپنے ارادوں میں امید سے زیادہ کامیاب ہوں، چند قاعدوں کی تلاش تھی اور پورا قانون بن گیا، اور غم بھی لاعلاج ہے کہ فرزندان ملک کی معلومات میں اضافہ کا سامان تو ہو گیا مگر خود میرے بچے ضروری تعلیم سے بھی محروم رہ گئے پھر بھی اس خیال سے تسلی ہو جاتی ہے کہ اس تجارت میں نقصان کا پلہ ہلکا اور نفع کا پلہ بھاری ہے۔

یہ بھی خدا کی خاص عنایت تھی کہ کتاب اشاعت سے پہلے مشہور ہو گئی۔ برسوں سے طلب کتاب میں برابر خطوط آتے رہے۔ یہی شہرت فاضل شارح پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے ادیب سے تعارف کا سبب بنی۔ موصوف کی نکتہ رسی اور دقیقہ شناسی نے جہاں کتاب کو مفید عام مانا وہاں اسے لائق شرح بھی جانا، بلکہ شرح کی تکلیف بھی خود ہی گوارا فرمائی۔ عام دستور ہے کہ متن کی اشاعت کے بعد اگر ضرورت سمجھی جاتی ہے تو شرح بھی لکھی جاتی ہے۔ مگر اس کتاب کے لیے جس کا موضوع جدید، مباحث دقیق بہتر یہی معلوم ہوا کہ کتاب مع شرح شائع ہو چنانچہ تبادلہ خیالات سے جو مصنف و شارح میں ضروری تھا مفید نتیجے نکلے۔ حصہ اول کی ترتیب میں کچھ تبدیلی ہوئی اور حصہ دوم میں بعض اجمالی بحثوں کی تفصیل ہو گئی۔ کتاب کا موجودہ طرز پر چھپنا بھی اسی کا رہین منت ہے۔

التماس خاص

یہ کتاب اردو ادب کے دربار میں حقیر تحفہ سہی مگر نیا تحفہ ضرور ہے، ارباب بینش سے التماس ہے کہ بعد مطالعہ رائے قائم کرنے میں جلدی نہ کریں کہ اکثر مسائل کی پیچیدگیوں اور مفاہیم کی باریکیوں نے خود مصنف کو بار بار دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ جس طرح مصنف کی غلطی غلط فہمی پھیلا سکتی ہے اسی طرح نقاد کی غلط فہمی بھی غلطی میں ڈال سکتی ہے۔

بحیثیت
اردو۔

دیباچہ

—— از محشی ——

اردو زبان کی فطرت میں ترقی کا وہ مادہ موجود ہے کہ دشمنوں کی مخالفت اور دوستوں کی غفلت کے باوجود دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ روز نئی نئی کتابیں لکھی جاتی ہیں، نئے نئے ادبی رسالے نکلتے رہتے ہیں، ابھی کچھ دنوں پہلے ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ گروہ میں اپنی زبان سے جو بے رغبتی تھی وہ بھی کم ہوتی جاتی ہے، اب انگریزی داں نوجوانوں میں اُردو پڑھنے اور لکھنے کا شوق بڑھتا جاتا ہے مگر جہاں یہ سب باتیں اُردو زبان کے بہی خواہوں کیلیے مسرت کا سامان ہیں، وہاں ایک بات ایسی بھی ہے جو اُنکی خوشی کو افسردگی سے بدل دیتی ہے۔ وہ یہ کہ اُردو کے اکثر نئے لکھنے والے اپنی زبان کی فصاحت، اس کی حقیقی لطافت اور ذاتی محاسن سے بے خبر ہیں، وہ اپنی تحریروں میں انگریزی انشا پردازی کی تقلید کرتے ہیں، جملوں کی ساخت، کلام میں زور پیدا کرنے کے طریقے، اظہار جذبات کے انداز سب بالکل انگریزی ہوتے ہیں، انگریزی انشا پردازی کی نقل سے ہماری زبان کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ ایک اردو داں انگریز اس صورت حال کو "زبان کی موت" کہتا ہے۔ بہر حال مجھے انگریزی کا

غلطیوں کا امکان کیا یقین ہے۔ اہل نظر کلیات میں مستثنیات نکال کے
انھیں زیادہ مستحکم کریں گے۔ اُن کے بیان کے لیے بہتر الفاظ تلاش کریں گے۔ اُنکی
ترتیب بدلیں گے۔ یہ سب کچھ ہوگا مگر اوّلیت کا فخر اور رہنمائی کا شرف مصنف
ہی کو حاصل رہے گا۔

اُردو میں قواعد زبان کی بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن اُن کے
مؤلفوں نے اکثر فارسی و عربی صرف و نحو کی تقلید کی ہے کسی نے بہت جدت
کی تو اُردو کے قواعد کو انگریزی کے سانچے میں ڈھال دیا۔ سید انشا کی دریائے لطافت
کے سوا شاید اور کوئی کتاب ایسی نہ تھی جس کے مصنف نے اُردو زبان کی ساخت
اور اسکی خصوصیتوں پر نظر کر کے قواعد بنائے ہوتے اور مناسب اصطلاحیں
وضع کی ہوتیں۔ اب یہ دوسری کتاب ہے جو تالیف نہیں بلکہ ایک مستقل تصنیف
ہے۔ مگر ان دونوں کتابوں کا موضوع الگ الگ ہے۔ اسلیے یہ کتاب بھی اُردو
میں نقش اوّل ہی ہے۔ اس کتاب کا موضوع ہے الفاظ بالخصوص مترادفات
کا استعمال برمحل۔ جہانتک مجھے علم ہے اس موضوع پر ابتک کسی زبان میں
کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اسکی طرف جستہ جستہ اشارے البتہ پائے جاتے ہیں
مصنف نے اس کتاب میں انتہا کا اختصار ملحوظ رکھا ہے۔ اس میں شک
نہیں کہ اختصار عبارت کی بہت بڑی خوبی ہے مگر اس سے بعض اوقات
مطلب سمجھنے میں دقت پڑتی ہے۔ اسلیے میں نے حضرت مصنف کی اجازت سے
اس کتاب پر کہیں کہیں توضیحی حاشیے لکھ دیئے ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ حاشیے
عدیم الفرصتی کی وجہ سے جیسے ہونا چاہئے تھے ویسے نہیں ہیں۔ پھر بھی امید ہے

کہ ان سے مصنف کا مطلب سمجھنے میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور ملے گی۔

جن لوگوں کو قدرت نے غیر معمولی ادبی سلیقہ عطا کیا ہے اُن کو کسی قاعدے
کی ضرورت نہیں، اور قواعد کی اصل غرض ہے کیا۔ صحیح و سلیم مذاق کے فتووں
کا استقرا اور ان جزئیات سے کلیات قائم کرنا۔ لیکن معمولی صلاحیت کے لوگوں
کے لیے ان قواعد کا فائدہ ظاہر ہے۔ ایک فائدہ ان قواعد کا ایسا بھی ہے جس میں
معمولی و غیر معمولی کی کوئی تخصیص نہیں۔ جب کبھی کسی کلام کے فصیح ہونے یا نہ ہونے
کی بحث پیش آجائے گی تو اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں ان قواعد سے بڑی مدد
ملے گی اور کلام کی بہت سی کیفیتیں جن کو ابتک دل صرف محسوس کر سکتا تھا اب
زبان اُن کو بیان بھی کر سکے گی۔

انسان کا ذوق برابر بدلتا رہتا ہے، وہی چیز جو کل تک سوسائٹی میں
مقبول تھی آج مردود ہو جاتی ہے اسلیے اگر کچھ دن بعد ہمارا معیار فصاحت بدل جائے
تو کوئی تعجب کی بات نہیں، بلکہ آثار ایسے موجود ہیں کہ اُس کا بدل جانا بالکل
قرین قیاس ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ معیار فصاحت کی تبدیلی
کے بعد یہ کتاب بیکار ہو جائے گی۔ اس کتاب کا ایک فائدہ ایسا ہے جو ہر حالت
میں ہمیشہ باقی رہے گا، اگر یہ سوال پیدا ہو کہ بیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی
حصے میں اُردو کا معیار فصاحت اپنے ارتقا کی کس منزل میں تھا تو اس کا واضح
اور تفصیلی جواب اسی کتاب میں مل سکے گا۔

اُردو زبان کے قواعد صرف و نحو اور اصول فصاحت کے انضباط کی طرف
سب سے پہلے سید انشا نے توجہ کی۔ لیکن اصول و قواعد کی پابندی کا خیال

عام کر دینے میں تقدم کا شرف حضرت ناسخ کو حاصل ہے۔ ناسخ کے جانشین رشک، رشک کے جلالؔ اور جلالؔ کے آرزوؔ ہوئے۔ اس سلسلے کے ہر شخص نے اُردو زبان کا مزاج پہچاننے اور اُس کو حالتِ اعتدال پر قائم رکھنے کی کوشش کی۔ زبان کے متعلق مختلف مباحث پر رسالے لکھے لغت مرتب کیے۔ الفاظ و محاورات کی تحقیق و تصحیح اور اصُول فصاحت و بلاغت کے تجسس و تعین میں اپنی ساری عمر صرف کر دی۔ ان میں سے ہر شخص نے اپنے پیشرو کی تحقیق میں اضافہ کیا اور جہاں تک اصُول فصاحت کا تعلق ہے اب وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ناسخ نے جس کام کی ابتدا کی تھی جناب آرزو نے اُس کو اختتام تک پہونچا دیا۔

آخر میں میں حضرت مصنف کو اُن کی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں اور اس بیش بہا تصنیف کا اضافہ کرنے پر اپنی زبان کی طرف سے اُنکا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ قدردانان اُردو اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لینگے اور طلبۂ زبان اس سے بہت کچھ نفع اُٹھائینگے۔

(سید) مسعود حسن (رضوی) ادیب

ایم، اے

23-22

بس تمام الفاظ کسی زبان کے داخل اُردو زبان نہیں مثلاً پاؤں، گوڑ
دونوں ہندی ہیں لیکن لفظ اوّل مستعمل اور لفظ دوم متروک ہے
کہ اُردو کے موافق مزاج نہیں یا ابرو، مژہ دونوں فارسی ہیں مگر

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) اسی لیے مصنف نے سب سے پہلے اپنے موضوع کے لحاظ سے اُردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ کو کئی قسموں پر تقسیم کیا ہے۔ شاید بعض قسمیں ایسی بھی ہیں جن سے اصول کے بیان میں کام نہیں لیا گیا لیکن ان سے اُردو کی ساخت سمجھنے اور اس کا مزاج پہچاننے میں بڑی مدد ملیگی۔ اور لسانی و تنقیدی مسائل کے بیان میں سہولت ہوگی۔

[1] مصنف نے "متروک" اور "قابلِ ترک" الفاظ میں فرق کیا ہے۔ عام طور پر متروک اون الفاظ کو کہتے ہیں جو کبھی صحیح اور فصیح اردو میں داخل تھے مگر اب کسی وجہ سے استعمال میں نہیں آتے لیکن مصنف نے "متروک" کی اصطلاح کو اُن لفظوں سے مخصوص کر دیا ہے جو کبھی اُردو زبان میں داخل نہیں ہوئے۔ اور جن کے ہم معنی الفاظ موجود ہونے کی وجہ سے اُن کو زبان میں داخل کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔

جن لفظوں کو عام طور پر لوگ متروک سمجھتے ہیں اور اُن کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں اُن کے متعلق مصنف کی رائے یہ ہے کہ کسی لفظ کا کچھ زمانے سے زبانوں پر جاری نہ رہنا اوس کے ترک کی کافی وجہ نہیں ہے۔ ہاں اگر اوس کے استعمال میں کوئی قباحت ہو تو اُسے ضرور ترک کر دینا چاہئے۔ اِن قباحتوں کی تفصیل بھی مصنف نے آگے چل کر صفحہ ... میں کر دی ہے اور انھیں لفظوں کو جن میں کوئی قباحت موجود ہے قابلِ ترک کہا ہے۔

پہلا جزو زبان اور دوسرا جزو غیر ہے یا بعض الفاظ ایک معنی میں داخل اردو
ہیں اور دوسرے معنی میں خارج جیسے جھاڑ[1] بمعنی آگ روشنی مستعمل اور

---

[1] ظاہر ہے کہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے پھر بھی ایک حصہ ملک کی زبان میں دوسرے حصہ ملک کی زبان سے کچھ نہ کچھ فرق ضرور باقی رہے گا۔ جس خطے کے لوگ درخت کو جھاڑ کہتے ہیں اُن سے اِس لفظ کا ترک کروا دینا آسان نہیں ہے لیکن ناممکن بھی نہیں ہے۔ اگر زبان کی صحت و فصاحت کا کوئی معیار بنا دیا جائے اور اہل ملک اُس معیار کو تسلیم بھی کر لیں تو اِس طرح کے مقامی اختلافات کبھی نہ کبھی دور ہو ہی جائینگے۔ اور اگر روزمرہ کی بات چیت سارے ملک میں بالکل ایک سی نہ ہو جائے تو بھی تحریری اور کتابی زبان تو ضرور یکساں ہو سکتی ہے لیکن اگر زبان کی صحت و فصاحت کا کوئی معیار ہی مقرر نہ کیا جائے اور ہر جگہ کے مخصوص الفاظ و محاورات کا استعمال جائز رکھا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک مقام کے رہنے والے کی تحریر دوسرے مقام کے باشندے نہ سمجھ سکیں گے اور ایک ایک مفہوم کے لیے بے ضرورت اتنے اتنے الفاظ و محاورات زبان میں داخل ہو جائینگے کہ اُن سب سے واقف ہونا اور اُن سب پر عبور حاصل کرنا کسی کے امکان میں نہ رہیگا۔ مختصر یہ کہ بغیر کوئی معیار مقرر کیے ہوئے اردو زبان سمجھنے والوں کا حلقہ وسیع نہ ہو سکے گا اور وہ ملک کی مشترکہ زبان نہ بن سکیگی۔ جن وجوہ سے زبان کا معیار مقرر کرنا ضروری ہے انھیں وجوہ سے کسی مقام کو زبان کا مرکز قرار دینا بھی ضروری ہے۔ دہلی اور لکھنؤ اپنی خصوصیتوں کے اعتبار سے زبان کے مرکز قرار پا چکے ہیں۔ مصنف نے بھی انھیں دونوں شہروں کو اُردو کا مرکز مانا ہے۔

بمعنی درخت خارج ۔ یا منت بمعنی خوشامد داخل اُردو اور بمعنی احسان خارج[1]

الغرض جو الفاظ استعمال میں موجود ہیں وہی اُردو زبان کے اجزائے ترکیبی ہیں ورنہ اجزائے غیر ہیں ۔ جو غریب غیر مانوس کے نام سے ذکر کیے جائینگے

اجزائے ترکیبی ہیں وہ کلمات کہ خود ہی اُردو زبان کے موافق مزاج ہیں دو طرح کے ہیں (۱) اجزائے حقیقی (۲) اجزائے غیر حقیقی ۔ اور وہ کہ موافق مزاج بنا لیے گئے ہیں اپنے محل پر ذکر کیے جائینگے ۔

تشریح اجزائے حقیقی و غیر حقیقی

اجزائے حقیقی صرف ہندی، فارسی، عربی زبانون کے الفاظ ہیں[2]

[1] مصنف کا قول یہ ہے کہ منت "بمعنی احسان اُردو سے خارج ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اردو میں لفظ منت" تنہا احسان کے معنی میں مستعمل نہیں ہے ۔ ترکیب فارسی کے ساتھ البتہ احسان کے معنی دے سکتا ہے جیسے منت پذیر، منت کش وغیرہ ۔

[2] یعنی بغیر کسی لفظی و معنوی تصرف کے اور بغیر ترکیب مستعمل ہیں کچھ الفاظ ایسے ہیں جو اُردو میں بغیر ترکیب فارسی کے قابل استعمال نہیں اُن کی بحث آگے دیکھیے ۔

جن میں سے ہر ایک کے بغیر تکمیل زبان محال ہے[1] کہ اکثر الفاظ اپنے معنی میں منفرد اور بدل اُن کے مفقود ہیں[2] شلاً گتا، کہنی، پسلی، کوڑی وغیرہ ایسے ہندی الفاظ ہیں جن کے بدل غیر ہندی نظر نہیں آتے ۔ یا شانہ، بازو، کمر، بغل وغیرہ فارسی بھی ایسے ہیں جن کے بدل نہ ہندی پائے جاتے ہیں نہ عربی ۔ یا انتظار، اعتبار، اختیار وغیرہ عربی ہیں جن کے بدل نہ فارسی نظر آتے ہیں نہ ہندی ۔ لہذا یہ اُردو زبان کے اجزائے حقیقی ہیں[3] جو اس کی بنیاد کو مشترک بنائے ہیں ۔ باقی تمام زبانوں کے الفاظ

[1] یعنی ہر ایک زبان نہ کہ ہر ایک لفظ ۔

[2] اس بیان سے مصنف کی مراد یہ نہیں ہے کہ مختلف زبانوں کے جو الفاظ اوپر مذکور ہوئے ان کے بدل کسی دوسری زبان میں موجود ہی نہیں بلکہ اُن کے ہم معنی کسی دوسری زبان کے الفاظ اردو میں مستعمل نہیں

[3] اجزائے حقیقی کی تعریف جن لفظوں میں کی گئی ہے اُن سے سرسری نگاہ میں یہ اعتراض پیدا ہو سکتا ہے کہ جب انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی، اطالوی وغیرہ زبانوں کے بھی الفاظ اُردو میں مستعمل ہیں جو اپنے معنی میں منفرد ہیں اور جن کے بدل مفقود ہیں تو یہ الفاظ بھی اُردو کے اجزائے حقیقی میں کیوں داخل نہیں کیے گئے ۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ مصنف نے صرف اُن زبانوں کے لفظوں کو اجزائے حقیقی مانا ہے جن کے اگر کل الفاظ نکال ڈالے جائیں تو زبان اظہار مطالب میں بالکل عاجز ہو جائے ۔ ظاہر ہے کہ ابھی تک یہ حیثیت صرف ہندی، فارسی اور عربی لفظوں کو حاصل ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ ، پر ملاحظہ ہو)

جو اردو میں بولے جاتے ہیں غیر حقیقی ہیں۔ اجزائے حقیقی بھی دو طرح کے ہیں۔ (۱) اصولی (۲) تکمیلی۔

تفریق اجزائے اصولی و تکمیلی

اجزائے حقیقی میں صرف الفاظ ہندی و فارسی اجزائے اصولی ہیں کہ انہیں کی آمیزش سے اردو کا ہیولا قائم ہوا۔ اور انھیں کے قواعد صرف و نحو بھی اپنی اپنی حد میں جاری و ساری نظر آتے ہیں۔ جو محل مناسب پر ذکر کیے جائینگے اور اجزائے تکمیل زبان الفاظ عربی ہیں کہ اکثر قواعد ہندی و فارسی کے زیر اثر قلت لفظی کو پورا کرنے میں معین رہا کرتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹) اس لئے مصنف نے انھیں کو اردو کے اجزائے حقیقی قرار دیا ہے اب انگریزی الفاظ بھی زبان میں برابر شامل ہو رہے ہیں مگر ابھی تک ان کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے اگر آئندہ کبھی انگریزی کے الفاظ بھی زبان میں اسی کثرت سے داخل ہو جائیں اور ان کے ہم معنی دوسری بولی کے لفظ جو اس وقت رائج ہیں متروک ہو جائیں تو انگریزی الفاظ بھی اردو کے اجزائے حقیقی میں شامل کیے جا سکیں گے۔ ۱؎ اجزائے اصولی ان زبانوں کے لفظ ہیں جن سے اردو نے حرف لفظ ہی نہیں لیے ہیں بلکہ قواعد صرف و نحو بھی لیے ہیں ظاہر ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ)

تفصیل اجزائے غیر بنیادی و امدادی

اردو کی اصل وہی زبان مانی جا سکتی ہے جسکے الفاظ سے بلا شرکت غیرے کوئی ایسا جملہ بن جائے جسے اردو کہہ سکیں۔ یہ بات سوا الفاظ ہندی کے غیر ہندی کو حاصل نہیں مثلاً میر ؎

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

دیکھو کہ شعر بھر میں کوئی لفظ غیر ہندی نہیں اور مطلب ادا ہو گیا۱؎۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کہ اردو زبان کی صرف و نحو بالکل ہندی ہے فارسی نحو سے تو کچھ نہیں لیا گیا۔ ہاں کچھ قواعد صرفی لے لیے گئے ہیں اس وجہ سے فارسی لفظ بھی اجزائے اصولی میں شامل کر لیے گئے ہیں عربی کے الفاظ بھی اردو میں قواعد صرف کے مطابق تغیر قبول کرتے ہیں مثلاً واحد کی جمع عربی قاعدے سے بن سکتی ہے یا رب کے، اسم فاعل، اسم مفعول اسم آلہ، اسم ظرف وغیرہ اردو میں مستعمل ہیں مگر یہ سب الفاظ منقول ہیں اور فارسی کے توسط سے اردو میں آئے ہیں۔

۱؎ خود مصنف نے ایسے سیکڑوں شعر کہے ہیں جن میں کوئی لفظ غیر ہندی نہیں آیا اور زبان کی فصاحت قائم رہی ان میں سے بعض شعروں کو (بقیہ حاشیہ صفحہ ۹ پر)

برخلاف اسکے کلمات غیر ہندی سے کوئی ایسا جملہ نہیں بنتا جسے بغیر شرکت
لفظ ہندی کے اردو کہہ سکیں مثلاً غالب ؎

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

اس شعر کا اُردو کہا جانا صرف آمد کی جگہ آیا استعمال کرنے پر موقوف ہے
اس تفصیل سے اُردو زبان کے اجزائے بنیادی ہندی اور اجزائے امدادی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تو قدرت بیان اور زبان دانی کا معجزہ کہہ سکتے ہیں. چند مثالیں
ملاحظہ ہوں ؎

جو سامنے ابتک آئے نہیں کیوں دھیان میں آئے جاتے ہیں
انکھوں سے ابھی تک اوجھل ہیں اور جی میں سمائے جاتے ہیں

سچ بھی بُرا وہ جس کو سُن کر روگ کہیں تو جھوٹا ہے
جس کا لٹایا سب نے پایا جگ کو اسی نے لوٹا ہے

کالی گھٹا میں کوندا لپکا دے کے جو کوئل کوک گئی
جتنی گہری سانس کھنچی تھی اتنی لمبی ہوک گئی

رک جانے سے آنسو جو پسینا نہ ٹپک جائے
چھالا وہ اک اُبھرے کہ نہ پھوٹے نہ ٹپک جائے

آنسو رکے تھے آنکھ میں دھڑکن کا ہو بُرا
ایسی تھکان دی کہ پیالی چھلک گئی

کلمات غیر ہندی ہیں عام اس سے کہ وہ فارسی ہوں یا عربی یا ان کے علاوہ.
ہندی سے کوئی خاص زبان مراد نہیں بلکہ اس لفظ میں یائے نسبتی
ہے جو اندرون ملک کی تمام زبانوں کے اُن الفاظ کو جو اُردو میں مخلوط ہیں ملک ہند
کی طرف منسوب کر رہی ہے مثلاً آٹا بھاشا. ننھا گجراتی. منڈا پنجابی. کمیں
بنگالی. چودن سنسکرت زبان کا لفظ ہے مگر اُردو میں مناسبت ملک کے
سبب ہندی کہے جاتے ہیں. کہ اکثر میں تغیر صورت و تبدیل معنی سے

ــــہ آجکل لفظ 'ہندی' بالعموم اُس اُردو کے لیے مستعمل ہے جس میں فارسی و عربی کے
کثیر الاستعمال اور عام فہم الفاظ عمداً ترک کر کے سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ اور وہ الفاظ
جن کو ٹکسالی اُردو میں جگہ نہیں ملی استعمال کیے جانے لگے ہیں اور جس کو لکھنے کے لیے فارسی
حروف ترک کر کے ناگری حروف اختیار کیے گئے ہیں مگر لفظ ہندی مدتوں اُردو کے معنی
میں مستعمل رہ چکا ہے یہاں تک کہ وہ اُردو جس میں فارسی و عربی عنصر ہر اعتبار سے بہت غالب
تھا وہ بھی 'ہندی' ہی کہلاتی تھی لیکن اُس زمانے میں بھی جب زبان ہندی یعنی اُردو
کے الفاظ میں اُن کے ماخذ کے اعتبار سے امتیاز کرنا ہوتا تھا تو انھیں لفظوں کو ہندی
کہتے تھے جو ملک ہند کی کسی زبان سے تعلق رکھتے ہوں اعم اس سے کہ وہ بنگلے کے لفظ
ہوں یا گجراتی کے مرہٹی کے ہوں یا پنجابی کے. اس لیے الفاظ ہندی کی تعریف یوں ہونا
چاہیے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے الفاظ جو اُردو میں مستعمل ہیں ہندی
کہلاتے ہیں. یہاں قابل لحاظ یہ نکتہ ہے کہ مختلف ہندی زبانوں کے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱ پر)

امتیازِ اصلیت باقی نہیں رہا؎۔
یہی حالت فارسی؎ کی ہے جس میں رستم، سہراب وغیرہ ژندی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یہ الفاظ اپنی اصل کی رو سے بنگالی، گجراتی، مرہٹی، پنجابی وغیرہ ہیں لیکن محلِ استعمال کی رو سے اُردو میں سب کی حیثیت ایک ہے اس وجہ سے اصول و قواعد کے بیان میں یہ تمام الفاظ ایک ہی نام سے یاد کیے جاتے ہیں مصنف کی باریک بیں نگاہ غالباً سب سے پہلے اس نکتہ تک پہونچی ہے۔

؎ ان تمام لفظوں کو ہندی کہنے کی ایک وجہ مصنف نے یہ بتائی ہے کہ ان میں سے اکثر کے تلفظ یا معنی اُردو میں بدل گئے ہیں اور اُن کی صحت کا معیار اُن زبانوں کے لغت نہیں بلکہ اُردو کے لغت ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی لفظ کا تلفظ اصل زبان کے خلاف متعین ہو گیا ہو تو اُردو میں وہی غلط تلفظ صحیح اور اصل تلفظ غلط سمجھا جائیگا مثلاً "منار" کو "سور زوکا" یا "بان" کو "باز" کہنا اُردو میں درست نہیں یہی حال معنی کا ہے۔ مثلاً چورن کو مطلق سفوف کے معنی میں بولنا صحیح نہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان لفظوں میں از روے اصل کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ اس لیے جن لفظوں میں امتیازِ اصلیت ابھی تک باقی ہے اُن سے علیحدہ کرنے کیلیے ان لفظوں کا ایک مجموعی نام ہونا ضروری تھا۔ اگلے لوگوں نے ان کا نام ہندی نہایت مناسب تجویز کیا تھا مصنف نے بھی اسی کو باقی رکھا۔

؎ یعنی جس طرح ہندی سے کوئی خاص زبان مراد نہیں لی گئی اسی طرح فارسی سے بھی ایران یا ایران کے کسی خاص خطے کی خاص زبان مراد نہیں ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲ پر)۔

چلم، چق، قرق وغیرہ ترکی زبان کے الفاظ پہلے سے مخلوط تھے اور اسی کے حکم میں ملنے جاتے تھے بعد کو عربی الفاظ کے ساتھ آدم سُریانی، یوسف عبرانی، اسطرلاب غیرہ یونانی زبان کے الفاظ اگر شامل ہو گئے۔ مگر مخلوط فارسی میں کسی زبان کے الفاظ کو کوئی خاص امتیازی حیثیت نصیب نہوئی سوا الفاظِ عربی کے کہ وہ اصلی صورت میں اس کثرت سے اپنے کو پہنچوا ہے ہیں کہ انھیں بھی اجزائے حقیقی میں ایک جزو مستقل شمار کرنا پڑتا ہے۔ باقی تمام میز الفاظ کہ مذکور ہوئے یا غیر ممیز کہ تحقیق میں نہیں آئے اسی طرح اُردو کے جزو ذات بن گئے ہیں جس طرح ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں جذب ہو جایا کرتے ہیں جس کے ظاہر اور طریقے ہیں (۱) اپنی اصل کو گم کر دینا جیسے شطرنج کہ معلوم نہیں کس زبان کا لفظ ہے لہذا وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱) بلکہ اصل فارسی اور اُن تمام زبانوں کے الفاظ جو فارسی کا جزو بن گئے ہیں بلا امتیاز فارسی کہے گئے ہیں، عربی الفاظ البتہ مستثنیٰ ہیں اور اس استثنا کا سبب مصنف نے خود بتا دیا ہے۔

؎ یعنی زبان کے اجزائے حقیقی کے علاوہ جتنے الفاظ کہ زبان کے اجزائے ترکیبی ہیں داخل ہیں جو اپنی اصلی شکل میں اُردو کے مزاج کے موافق نہ تھے اور کسی تغیر کے بعد موافق مزاج ہوئے۔

جس زبان میں بولا جائے اوسی کا جزو ذات ہے۔ (۲) قبول اثر کے بعد متغیر ہو کر اپنی اصل سے غیر ہو جانا جس طرح اجزائے حقیقی میں کلماتِ غیر ہندی خود بھی بعد تغیر ذات حکم ہندی میں آجاتے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ وہ بلا تغیر زبان کے موافق مزاج نہ تھے۔

تغیرات اجزائے زبان

کلمات غیر ہندی میں فارسی و عربی اجزائے امتیازی ہیں جو اپنی صلیت اور اُردو کی مشترکہ بنیاد دونوں کے شاہد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بلا تغیر اپنے نام سے ذکر کیے جاتے ہیں یعنی فارسی اور عربی کہلاتے ہیں لیکن بعد تغیر دو ناموں سے موسوم ہوتے ہیں۔ (۱) ہند صوری (۲) ہند معنوی۔ قسم اول کو اُردو بھی کہتے ہیں۔ تغیرات صوری بعض مستقل ہیں بعض غیر مستقل۔ مستقل وہ تغیر ہے جس سے لفظ اپنی اصل کی طرف عود نہ کرے یعنی اصل صورت میں وہ نہ بولا جاتا ہو جسکی کئی صورتیں ہیں

(ا)۔ کسی حرف کا کم ہو جانا جیسے کاہ گل سے کہگل، صابون سے صابن۔

(ب) کوئی حرف بڑھ جانا جیسے ناخن سے ناخون، دکان سے دوکان۔

(ج) حروف میں کچھ تبدیلی ہو جانا جیسے کان سے کھان۔

(د) حروف و حرکات دونوں میں کچھ تبدیلی ہو جانا جیسے افشردہ سے آبشورہ، خرپزہ سے خربوزہ لیکن صرف حرکت کی تبدیلی یا تخفیف یا تشدید سے نہ لفظ کی صلیت مٹتی ہے نہ وہ اُردو کہا جا سکتا ہے جیسے عُنوان، کَلّہ، عُمّامہ کہ اصل میں یہ عِنوان، کَلَہ، عِمامہ ہیں۔ اس طرح کے الفاظ بہت ہیں جو محاورۂ عام میں غلط العام کہے جاتے ہیں۔

(ہ) صورت و معنی دونوں بدل جانا مثلاً آرماں ترکی زبان کا لفظ ہے جسکے معنی وضعی حسرت و افسوس کے ہیں مگر اُردو میں الف غیر ممدودہ اور اعلان نون کے ساتھ ارمان بولا جاتا ہے اور تمنا کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔ یا افراط و تفریط سے اقرا تفری کہ اب نہ وہ صورت ہی نہ وہ معنی۔ بس یہی تغیرات ہیں جنسے دوسری زبانوں کے الفاظ اُردو کے موافق مزاج بن کر مستقلاً اوس کے جزو ذات ہو جاتے ہیں۔

غیر مستقل وہ تغیر ہے جس سے لفظ پھر اپنی اصل کی طرف

عود کر سکتا ہے۔ یہ تغیرات کسی جزو کے اضافہ سے رونما ہوتے ہیں جو چند ہیں۔

(ا) مصدروں کا اختراع اور صیغوں کا اشتقاق جیسے قبولنا، بخشنا نوازنا، شرمانا، گرمانا وغیرہ۔

(ب) اسم (مذکر) بنانا جیسے فیض سے فیضو، بخش سے بخشو، رحم سے رحمو بہ واو معروف۔

(ج) اسم (مونث) بنانا جیسے نصیب سے نصیبن، شریف سے شریفن، یا رحم سے رحمو، بخت سے بختو بہ واو مجہول۔

(د) مصغر کرنا جیسے دیگ سے دیگچی، چمچہ سے چمچی وغیرہ بہ یائے معروف۔

(ہ) واحد کی جمع بنانا جیسے شیشے، غنچے، یاسمیں، بلبلیں وغیرہ

مذکورہ بالا ہر صورت غیر مستقل ہے کہ جب لفظ سے جزو زائد دور کر دو تو وہ پھر اپنی اصل کیطرف عود کر جائیگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو لفظ کسی قاعدۂ ہندی کے زیر اثر ہوگا وہ صورت حال میں اردو کہا جائیگا بس

لہ یعنی فارسی یا عربی لفظ میں ہندی کے کسی قاعدے کی رو سے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰ پر)

ہند معنوی۔ وہ کلمات غیر ہندی ہیں جنکے معنی اُردو میں بدل گئے ہیں مثلاً روزگار بمعنی ذریعہ معاش۔ بغیر ترکیب فارسی لائق استعمال اُردو ہے اور بمعنی زمانہ فارسی ہے جو بغیر ترکیب فارسی کے مستعمل نہیں ہوتا۔ مثلاً گردش روزگار، یا عرصہ بمعنی میدان عربی اور بغیر ترکیب فارسی لائق استعمال نہیں مگر بمعنی مدت مستعمل ہوتا ہے۔ غالب ؎

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو

عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کیے ہوئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اگر کوئی غیر مستقل تغیر ہو جائیگا تو صرف اسی متغیر صورت میں وہ لفظ اُردو کہا جائیگا لیکن جب تغیر دور ہو جائیگا تو پھر وہ لفظ اصل زبان کی طرف منسوب کیا جائیگا مثلاً دیگچی حالت تصغیر میں اور غنچے شمعیں حالت جمع میں تو اُردو الفاظ ہیں لیکن دیگ حالت اصلی میں اور غنچہ شمع حالت واحد میں اُردو نہیں۔

لہ روزگار اور عرصہ کی طرح بہت سے فارسی و عربی الفاظ کے معنی اُردو میں بدل گئے ہیں جیسے دریا، غصہ، ہمت وغیرہ اور وہ اپنے اصل معنی میں بغیر ترکیب فارسی کے مستعمل نہیں ہیں۔ شعرائے متقدمین کے کلام میں ان میں سے اکثر یا بعض لفظ اپنے اصل معنی میں بغیر ترکیب فارسی بھی استعمال ہوئے ہیں مگر وہ زمانہ وہ تھا جب اُردو کے قواعد صرف و نحو بھی مرتب نہ ہوئے تھے۔ معیار فصاحت کا کیا ذکر اس لیے اصول زبان کے معاملے میں ان کا کلام سند نہیں ہو سکتا۔

یا نعلین و حور صیغہ ہائے تثنیہ و جمع کا واحد کے معنوں میں بولا جانا کیونکہ دونوں
کا واحد نعل و حورا مستعمل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جمع نعلینیں اور حورین بھی
مستعمل ہے جسے جمع الجمع سمجھنا غلط فہمی ہے۔

ہندی الفاظ ہر حالت میں ہندی کہے جاتے ہیں کہ وہی اجزائے
بنیاد زبان ہیں اگرچہ اُن میں بھی اسی طرح تغیرات صوری و معنوی موجود ہیں
جیسے بادر سے بادل۔ تروار سے تلوار۔ چندر سے چاند وغیرہ تغیر صوری

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) اسی طرح تذکیر و تانیث اور وحدت و جمعیت میں بھی اگلے
کلام سے سند نہیں لی جا سکتی۔ میر صاحب نے جان کو کئی جگہ مذکر باندھا ہے۔
اور ایک شعر میں فرد واحد کی جان کو جمع قرار دیا ہے ؎

جن کے لیے اپنے تو یوں جان نکلتے ہیں
اس راہ سے وے جیسے انجان نکلتے ہیں

لیکن کیا اس شعر کی سند سے "جان" کو مذکر اور جمع بولنا آج بھی درست ہو سکتا ہے؟
اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بعض فارسی و عربی الفاظ ایسے بھی ہیں جو اردو میں
اپنے اصل معنی میں بھی مستعمل ہیں اور تغیر معنی کے ساتھ بھی مستعمل ہیں مثلاً تکرار کہ جھگڑے کے
معنی میں بھی رائج ہے اور دہرانے کے مفہوم میں بھی۔ ایسے لفظوں کو بلا ترکیب فارسی اصل
معنی میں بھی بول سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام الفاظ غیر ہندی جو اپنے اصل معنی میں اُردو
میں مستعمل ہیں وہ سب بغیر ترکیب فارسی لائق استعمال ہیں۔

کے شاہ جی۔ یا چورن سنسکرت میں آٹے کو کہتے ہیں مگر اردو میں خاص
قسم کی دوائے ہاضم کا نام ہوگیا۔ یا منڈا پنجابی میں لڑکے کو کہتے ہیں اور اُردو
میں ہر ایسے شخص کو جو سر کے بال صاف کرا دے۔

اس بحث سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ کلمات غیر ہندی کا عموماً اور
ہندی الفاظ کا خصوصاً اپنی اصل سے ہٹ کر صحیح اور فصیح قرار پانا اُردو
کے مستقل زبان ہونے کی قوی ترین دلیل[1] ہے۔

بحث اضافہ الفاظ

وقت ضرورت لفظ کا اضافہ اکثر غیر ہندی سے ہوتا ہے اور
قبولِ اثر[2] کے بعد وہ حکم ہندی میں آجاتا ہے کیونکہ ہندی سے اُردو زبان

[1] اردو میں مختلف زبانوں کے لفظ مستعمل ہیں مگر ان میں سے بعض کا ملفوظ بعض
کے معنی اور بعض میں دونوں بدل گئے ہیں یعنی از روئے اصل اُن کا ملفوظ یا معنی غلط
ہیں لیکن ہم اُردو میں اسی غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط مانتے ہیں اور الفاظ و محاورات
کی صحت و غلطی اور عبارت کی فصاحت و قباحت وغیرہ میں کسی دوسری زبان کے
لغت و قواعد صرف و نحو اور اصول انشا کی پابندی نہیں کرتے اس سے اردو کا مستقل زبان ہونا ثابت
ہوتا ہے۔ [2] قبول اثر سے کسی قاعدہ اُردو کے تحت میں (بقیہ نوٹ صفحہ ۱۹ پر ملاحظہ ہو)

کی بنیاد پڑی اور غیر ہندی سے اُسکی ترقی ہوئی اسی ضرورت سے انگریزی الفاظ
بھی اُردو میں داخل ہوئے اور برابر شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگرچہ
کثرت تعداد سے نمایاں اور قلّت لفظی کو دور کرنے میں مثل فارسی و عربی
کے معین ہیں مگر انھیں کوئی امتیازی درجہ نصیب نہ ہوا۔ کیونکہ یہ اُس وقت
آکر زبان میں شامل ہوئے جب اُردو اُردو ہو چکی تھی لہذا یہ اضافہ اُن نامون
تک محدود رہا جو نو ایجاد چیزیں اپنے ساتھ لائی ہیں مثلاً موٹر۔ انجن۔ بائیسکل
وغیرہ۔ یا اُن اصطلاحون پر موقوف رہا جنکے بدل اردو میں موجود نہیں جیسے
ڈگری۔ اپیل وغیرہ۔ ان میں بعض کی جگہ دوسرے الفاظ قائم ہو گئے جیسے
ایروپلین کی جگہ ہوائی جہاز بولا جانے لگا۔ اور بعض میں عام لہجے کے زیر اثر
تبدیلیاں ہو گئیں جیسے لین ٹرن سے لالٹین ہو کر ثقالت دور ہو گئی یہی
حالت معنوی تبدیلی کی ہے مثلاً گلاس شیشہ کو کہتے ہیں مگر اردو میں ظرف
آب کی وضع خاص کا نام ہو گیا جسکے لیے شیشہ کا ہونا بھی ضروری نہ رہا۔ اب
یہ الفاظ جزو زبان ہو گئے لیکن بعض الفاظ اپنی جگہ پر قائم ہیں کہ نہ اُنکی جگہ
دوسرے الفاظ نے لی نہ ان میں کوئی تغیر ہوا۔ اگر غور و فکر سے کام لیا جاتا

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کسی لفظ غیر ہندی کا کوئی صوری یا معنوی تغیر قبول کر لینا مراد ہے۔

تو اختراعات ناممکن نہ تھے۔ مثلاً پروگرام کی جگہ نظام عمل بولنے سے وہی
مفہوم بے کم و کاست ادا ہو جاتا ہے[1]۔ مگر اضافہ غیر ضروری مخرب زبان
ہے مثلاً مشق کی جگہ پریکٹس بولنا غیر ضروری ہی نہیں بلکہ مضر ہے کیونکہ
اس طرح نہ زبان ایک حالت پر قائم رہ سکتی ہے[2] نہ وہ علمی زبان بن سکتی ہے

[1] ہیچمدان محشی کی رائے میں جو انگریزی لفظ ہماری زبانون پر چڑھ گئے ہیں اور
کثرت استعمال سے عام فہم ہو چکے ہیں اُن کی جگہ عربی یا فارسی کے غیر مانوس الفاظ
یا مرکبات بولنا مناسب نہیں ہے۔

[2] زبان کے معاملہ میں جدت پسندی سے قدامت پسندی زیادہ مفید ہے۔ نئے
خیالات کیلیے نئے الفاظ یا محاورات کو زبان میں دخل کر لینا تو زبان کی وسعت کا
سبب ہو سکتا ہے لیکن جو الفاظ و محاورات پہلے سے ہماری زبان میں موجود ہیں
اور جنکو زباندان جانتا ہے اُن کو بلا ضرورت ترک کرکے دوسرے الفاظ و محاورات
لے لینا یقیناً مضر ہے اگر اس معاملے میں روک تھام نہ کی جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ
کچھ مدت کے بعد اُردو کا ذخیرۂ الفاظ بالکل بدل جائے پھر اگر الفاظ کے ساتھ
جملون کی ساخت اور ادائے مطلب کے عنوان وغیرہ بھی دوسری زبانون سے
آزادی کے ساتھ لیے جانے لگیں تو زبان کی ہیئت ہی تھوڑے دنون
کے بعد بالکل بدل جایا کرے۔ نہ اُردو کی صرف و نحو کے قواعد بن سکیں نہ فصاحت
و بلاغت کا کوئی معیار قائم ہو سکے اگر قواعد بنے بھی اور معیار و (بقیہ نوٹ صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ ہو)

نہ اس کا سرمایہ تصنیف و تالیف کارآمد رہ سکتا ہے[1]

(بقیہ صفحہ گذشتہ) قائم رہا بھی تو وہ بھی کچھ دن بعد بیکار ہوجایا کریگا دنیا کی ہر چیز کی طرح زبان خود ہی تغیر قبول کرلینے کے لیے تیار ہے۔ اسلیے زبان کے بہی خواہوں اور ماہروں کا فرض ہے کہ وہ تا امکان اُسے نامناسب تغیرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ زبان میں مطلق تغیر نہو البتہ یہ فائدہ ہو سکتا ہے کہ تغیر جزوی اور تدریجی ہو کہ ایک عہد کی زبان دوسرے عہد کی زبان سے بالکل الگ نہ معلوم ہو۔

[1] جب کچھ مدت کے بعد زبان بالکل بدل جایا کرے گی تو ایک زمانے کی لکھی ہوئی کتابیں دوسرے زمانے کے لوگ سمجھ ہی نہ سکینگے۔ اس طرح تمام سرمایہ تصنیف و تالیف تھوڑے تھوڑے دنوں بعد بیکار ہوجایا کریگا۔ مصنف نے جس خطرے سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے اسکی روشن تاریخی مثال زبان فارسی کی سرگزشت ہے۔ عربوں نے جب ایران پر تسلط حاصل کیا تو ایرانیوں نے عربوں کا مذہب اور تمدن اختیار کرلیا۔ اُنکی مذہبی زبان بھی عربی ہوگئی اسلیے اُنھوں نے اپنی زبان کو عربی کے اثر سے محفوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی اور عربی الفاظ و محاورات وغیرہ بےضرورت بھی استعمال کرنا شروع کردیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اصل فارسی کے بیشمار لفظ متروک ہوگئے اور زبان میں اتنا تغیر ہوگیا کہ عربوں کے تسلط سے پہلے کی فارسی زبان آجکل کے ایرانی سمجھ نہیں سکتے۔ چنانچہ اُس زمانے کی چند کتابیں جو اب تک محفوظ ہیں اُنکی زبان آجکل کی فارسی سے بالکل الگ ہے۔ عربی کا اثر (بقیہ نوٹ صفحہ ۴۵ پر ملاحظہ ہو)

بس یہی[1] ہے حد اجزائے زبان جس سے تجاوز نہ کرنا چاہیے۔

تفریق اجزائے زبان باعتبار نقص و کمال

اجزائے زبان اپنے نقص و کمال کے اعتبار سے دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ کہ اپنی وضع پر قائم اور انفراداً لائقِ استعمال ہیں جیسے ہار جیت

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) قبول کرنے کے بعد بھی ایرانیوں نے کسی دوسری زبان کے لفظوں اور محاوروں وغیرہ کو اس آزادی سے نہیں لیا۔ اسلیے گو زبان میں تھوڑا تھوڑا تغیر ہوتا رہا مگر اسقدر کم کہ شاہنامہ فردوسی آج ہزار برس کے بعد بھی ہر ایرانی بغیر سمجھائے ہوئے سمجھ سکتا ہے۔ اس ایک مثال سے زبان کے معاملے میں جدت پسندی کا نقصان اور قدامت پرستی کا فائدہ دونوں ظاہر ہوجاتے ہیں

[1] یہ اشارہ صرف اضافۂ الفاظ کی بحث کی طرف نہیں ہے بلکہ اجزائے زبان کی پوری بحث کی طرف ہے یعنی اس بحث میں یہ بتایا گیا ہے کہ مختلف طرح کے اجزا کو اُردو زبان میں کس حد تک دخل ہے۔ ان حدود سے تجاوز نہ کرنا چاہیے۔ ورنہ عبارت اکثر غیر فصیح اور کبھی کبھی مہمل ہوجائیگی۔

وغیرہ ان کو مفردات تامّہ کہتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں کہ انفراداً صلاحیت
استعمال نہیں [1] رکھتے۔ یہ اجزائے ناقصات کے نام سے ذکر کیے جائینگے۔

بیان ناقصات

ناقصات کئی طرح کے ہیں۔ (۱) وہ کہ وضعی صورت [2] پر اپنے معنی

---

[1] یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ انفرادی حیثیت میں انکے کوئی معنی ہی نہوں بلکہ اُردو میں وہ انفراداً استعمال نہوتے ہوں مثلاً لالہ زار اور فیل بان میں زار اور بان انفراداً کوئی معنی نہیں دیتے اور وحشت خیز اور مالدار میں خیز اور دار اپنے مستقل معنی رکھتے ہیں اور فارسی میں مستعمل ہیں لیکن اُردو میں انفراداً استعمال نہیں ہوسکتے اسلیے اُردو میں خیز اور دار کی وہی حیثیت ہے جو زار اور بان کی اسلیے مصنف نے دونوں طرح کے لفظوں کو ناقصات میں شامل کرلیا ہے۔

[2] یعنی اصلی صورت میں برخلاف قسم دوم کے کہ وہاں لفظ اپنی اصلی صورت میں اظہار معنی میں عاجز نہیں ہے بلکہ حالت ترکیب میں انکی جو صورت ہوجاتی ہے اُس صورت میں وہ کوئی معنی نہیں رکھتا "پن گھٹ" کے دونوں اجزائے ترکیبی پن اور گھٹ موجودہ صورت میں انفراداً اپنا مفہوم ظاہر نہیں کرسکتے حالانکہ اصلی صورت میں یعنی پانی اور گھاٹ اظہار مفہوم میں عاجز نہیں ہیں۔

آپ نہ ظاہر کرسکیں جیسے دردانگیز۔ وحشت خیز۔ فیل بان۔ عطردان۔
لالہ زار۔ ہوشیار۔ مالدار۔ گاڑی وان وغیرہ میں جزو دوم۔ یہ الفاظ
غیر مستقل کہلاتے ہیں۔

(۲) وہ کہ بسبب تخفیف کے اظہار معنی میں عاجز ہوں جیسے بے آبان
سے بیابان ہوکر اسکے اجزائے ترکیبی نہ علٰحدہ نظر آتے ہیں نہ اپنے معنی آپ
ظاہر کرسکتے ہیں۔ یا پانی گھاٹ سے پنگھٹ بنکر دونوں مفردات تامّہ
ناقص بن گئے۔ یا دھوم دھڑکا۔ گینددھڑکا میں جزو دوم دھڑاکا سے دھڑکا
بن کر ناقص ہوگیا۔ اور نہیں پر تو گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ مرکب ہے حالانکہ
نہ اور ہی سے بنا ہے جن میں نہ حرف نفی اور ہی ایسا لفظ ہے کہ اسم
کے ساتھ حصر اور فعل کے ساتھ تاکید کا فائدہ دیتا ہے جو کثرت استعمال سے
مخفف ہوکر نہیں بنگیا ہے۔ مثلاً بغیر تاکید کہینگے "کہ یہ کام نہوگا" اور جب
نفی پر زور دینا ہوگا تو یہ کہینگے "یہ کام نہیں ہوگا" مگر وہ مفرد کے
شبہ میں بلا تاکید بھی استعمال ہوا کرتا ہے اس قسم کے مرکب اُردو
میں بہت ہیں جیسے یہ۔ یہاں سے یہاں، وہ ہاں سے وہاں، ہم۔ ہی
سے ہمیں، مجھ۔ ہی سے مجھی وغیرہ۔

(۳) وہ کہ اُنکی ہستی دوسرے لفظ کی ہستی کے ساتھ وابستہ ہو یہ تابع مہمل کہلاتے ہیں۔

تابع مہمل لفظ موضوع کی اُس بگڑی ہوئی صورت کا نام ہے جو تائید معنی کا فائدہ دیتی ہے۔ اگر لفظ موضوع اسم ہے تو کثرت۔ اور فعل ہے تو شدت کے معنی ظاہر ہونگے۔

توابع سماعی بھی ہیں اور قیاسی بھی۔ سماعی وہ ہیں جو غیر مقرر حروف کی تبدیلی کے ساتھ پائے جاتے ہیں جیسے نالا کھولا۔ رونا دھونا۔ آن بان ہشاش بشاش وغیرہ۔ قیاسی وہ ہیں کہ حسب ضرورت بنا لیے جاتے ہیں جنکے دو طریقے ہیں (۱) یہ کہ اگر لفظ موضوع کا حرف اوّل واو ہے تو الف سے بدلکر اوّل میں بولیں گے جیسے اخشت وحشت (۱) اور اگر حرف اوّل الف ہے تو واؤ سے بدلکر آخر میں بولینگے جیسے آدمی وادمی۔ اور اگر حرف اوّل نہ الف ہے نہ واؤ تو اسی قیاس پر الف سے بدلکر پہلے یا واؤ سے بدلکر آخر میں بولینگے۔ مثلاً الہو پہلو اغلی بغلی۔ گھوڑا دوڑا۔ بکری وکری۔

ایسے الفاظ بھی ہیں کہ انفراداً دونوں مہمل ہیں مگر ہیئت ترکیبی

میں ایک دوسرے کے ساتھ معین ہوکر کسی خاص معنی کا فائدہ دیتے ہیں۔ مثلاً اہر تہر۔ الّم غلّم۔ انجر پنجر۔ اختر بختر۔ گھما گھمی وغیرہ[1] (۴) ایسے الفاظ بھی ہیں کہ اظہار معنی میں عاجز نہیں مگر انفراداً غیر مانوس معلوم ہوتے ہیں جنمیں بعض کثرت استعمال سے معروف اور بعض قلت استعمال سے غیر معروف ہیں۔

معروف وہ ہیں جو مثل کلمہ غیر مستقل کے غیر مقرر الفاظ کے ساتھ ممزوج اور مربوط پائے جاتے ہیں مثلاً نیلی فام۔ لالہ فام۔ چراگاہ نشست گاہ میں جزو دوم۔ اس بحث میں کلمات فارسی وعربی مخلوط نظر آتے ہیں مثلاً خیمہ گاہ۔ سیر گاہ۔ ارادت کیش۔ عقیدت کیش وغیرہ میں جزو اوّل عربی ہے

غیر معروف وہ کلمات ہیں جو مثل تابع مہمل کے اپنے مقررہ الفاظ

[1] یہ لفظ صورت سے مرکب معلوم ہوتے ہیں اور انکے اجزا میں سے ایک لفظ دوسرے کا تابع معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ الگ الگ ہر جزو مہمل ہے یعنی صرف بلحاظ صورت یہ لفظ مرکب ہیں اور بلحاظ معنی مفرد۔ چونکہ مصنف نے معنی الفاظ سے قطع نظر کرکے صرف صورت الفاظ سے بحث کی اسلیے اُن کو زبان کے اجزائے ناقصہ میں شامل کیا ہے جو الفاظ یہاں مثال میں پیش کیے گئے ہیں اُنکے معنی ذیل میں درج کیے جاتے ہیں "اہر تہر" بیمار کی نازک حالت، "الّم غلّم" اچھا برا۔ "انجر پنجر" جوڑ بند۔ اختر بختر۔ پھیلا ہوا اسباب، گھما گھمی۔ چہل پہل۔ گرمی محفل۔

کے سوا غیر مقررہ کلمات کے ساتھ موانست نہیں رکھتے مثلاً صبح و مسا، شام و بگاہ، شب یلدا، زلف چلیپا وغیرہ میں جزو دوم اور پگڈنڈی میں دونوں غیر معروف ہیں۔ اگر ان کلمات کو غیر مقررہ الفاظ کے ساتھ بولو تو مہمل معلوم ہونگے مثلاً بگاہ و مسا، شام یلدا، گیسوئے چلیپا بس یہی ناقصات اردو میں۔

مرکبات اردو زبان

مرکبات اُردو بھی دو طرح کے ہیں (۱) امتزاجی۔ (۲) غیر امتزاجی۔ امتزاجی وہ مرکب ہے جس کے اجزا میں ایک یا دونوں صورت حال میں انفراداً لائق استعمال نہوں جنکی مثالیں ناقصات کی بحث میں آچکیں صرف قسم چہارم کی مثالیں اس تعریف میں نہیں آتیں[۱]۔

غیر امتزاجی وہ مرکب ہیں جنکا کوئی جزو ناقص نہو۔ یہ بھی دو طرح کے پائے جاتے ہیں ایک تو وہ جن کی ہیئت ترکیبی ہندی و فارسی میں ایک سی ہوتی ہے مثلاً (صفحہ ۱۰ پر ملاحظہ ہو)

[۱] یعنی شام و بگاہ۔ لیل و نہار وغیرہ مرکب امتزاجی نہیں کہے جاسکتے۔

ترکیب	توصیفی	مفعولی	اضافی	ظرفی	فاعلی
فارسی	خوش نصیب	دل سوختہ	شوق نامہ	قمارخانہ	تیغ زن
ہندی	ہنس مکھ	جی جلا	جل مانگ	ناچ گھر	لٹھ مار

اس طرح کے جتنے مرکب غیر ہندی ہیں اتحاد ہیئت ترکیبی سے اپنے ہمصورت مرکبات کی طرح ہندی کی علامت جمع قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں مثلاً خوش نصیبوں۔ دل سوختوں، صاحب دلوں۔ شوق ناموں۔ قمارخانوں وغیرہ بولے جاتے ہیں اور فصیح معلوم ہوتے ہیں۔ لہذا ایسے مرکبات کو ہم اپنی اصطلاح میں "مرکب مماثل" کہینگے۔

دوسرے وہ مرکب ہیں کہ انکی ساخت ہندی و فارسی میں الگ الگ ہے جیسے مہر و وفا میں، واؤ عاطفہ اور دستِ دعا میں کسرۂ اضافت ایسی علامتیں ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ یہ منقولات سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جمع بھی ہندی قاعدے سے نہیں بنتی اور بناؤ بھی تو مہمل معلوم ہوتی ہے مثلاً مہر و وفاؤں۔ دست دعاؤں بولنا نہ صحیح ہے نہ فصیح لہذا یہ "مرکب متنافر" کہکر ذکر کیے جائینگے۔

بعض صورتیں اسکے خلاف بھی پائی جاتی ہیں مثلاً ع کون لیتا ہے
خبر بے سر و سامانوں کی۔ یا ع قفس میں لائی کشش مجکو آب و دانے کی
تو انھیں مستثنیات سے سمجھنا چاہیے ! ور بہتر یہی ہے کہ ان سے بھی
احتراز کیا جائے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جو ہیئتیں ہندی و فارسی میں ایک
سی ہیں اگر انکے افراد مختلف بھی ہوں تو غلط نہیں مثلاً دل اداس،
تارگھر، اختر نگر، جوش بھرا، داغ جلا وغیرہ ؎

میر کی گرمی اس سے اچرج ہے — کس سے ملتا ہے وہ دماغ جلا

اس طرح کی ترکیبوں کو ترکیب فارسی خیال کرنا غلط فہمی اور انھیں غلط
کنا اپنی غلطی ہے۔

اس تمام تحقیقات سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ مفردات سے دائرہ زبان
قائم ہوا اور مرکبات سے اس کی تزئین و تکمیل ہوئی۔

متروکات کا بیان

قبل اسکے کہ بحث استعمال الفاظ آغاز ہو ایسے الفاظ کا ذکر بھی ضروری

ہے جن کا استعمال کسی وجہ سے نادرست ہے وجوہ مختلف ہیں (۱) یہ کہ
لفظ غلط ہو (۲) یہ کہ غیر مانوس ہو (۳) یہ کہ زائد ہو۔ ان میں بعض کا ترک
ضروری اور بعض کا ترک اولیٰ ہے۔

معیار صحت کلمات

ہر لفظ اپنی اصل سے ہٹنے کے بعد یا صحیح خیال کیا جاتا ہے یا غلط سمجھا
جاتا ہے۔ صحیح وہ لفظ ہے جو ہر حالت میں بلا اختلاف عام و خاص ایک
طرح بولا جاتا ہو۔ اگر اس میں تغیر صوری ہے تو اردو ہے اور معنوی تبدیلی
ہے تو ہندی ہے۔ صرف اعراب کی تبدیلی کوئی چیز نہیں کہ اسے نئے نام
سے موسوم کیا جاتا۔ جیسا کہ تغیرات اجزا کی بحث میں بیان ہو چکا۔

غلط وہ الفاظ ہیں جنھیں خواص اصل کے مطابق بولتے ہیں اور
عوام اپنی جہالت سے جس طرح چاہتے ہیں بولا کرتے ہیں جیسے کباب شوربا
کو کواب اور شردا یا بے سمجھ کو ناسمجھ یا نسوت کے قیاس پر نخالص بولنا
یہ سب صورتیں غلط ہیں۔ رہائش کی وضع بھی صحیح نہیں کہ کسی زبان کے
مخصوص حروف کا امتزاج غیر زبان کے کلمات کے ساتھ درست نہیں

صرف نابجھ نو عمر کے معنی میں غلط نہیں کہ وہ محاورۂ اردو ہے۔ یا وہ حرف کہ ہندی و فارسی میں ایک معنی میں ایک ہی طرح مستعمل پائے جاتے ہیں مثلاً نہ تھا۔ نہ بود میں نون "نافیہ"۔ بیڈھب بیدم میں بائے نافیہ۔ لالی۔ سُرخی میں یائے نسبتی وغیرہ۔ یا جن میں مشترک حالت پائی جائے قابلِ تامل نہیں۔

ناقصات میں بھی غیر ہندی کا خلط ہندی لفظوں کے ساتھ جائز نہیں لہذا دکھ زدہ۔ سنسنی خیز۔ گاڑی بان وغیرہ کی ترکیب غلط ہے لیکن ناقصات ہندی کا خلط غیر ہندی کے ساتھ درست ہے مثلاً فیل بان کی جگہ فیل وان کہنا غلط ہوگا لیکن گاڑی وان کو گاڑی بان کہنا اصولاً غلط ہوگا کہ اردو کی ترکیب اصلی ترکیب ہندی ہے پھر بھی کسی کلمہ سے اسکا جزو ممزوج علحدہ کر کے جزو غیر شامل کرنا فعل عبث بلکہ مذموم ہے[1] بعض اغلاط ترکیبی خصوصیات ترکیبات کے تحت میں بیان ہونگے کہ ابھی ذکر اُن کا قبل از وقت ہے۔

---

[1] یعنی فیل بان کو فیل وان کہنا اصولاً صحیح ہے مگر فصیح نہیں۔

تعریف غیر مانوس

غیر مانوس وہ کلمہ ہے جو بمقابلۂ ثقیل۔ یا کریہ۔ یا غریب ہو۔

ثقیل وہ ہے کہ بولا جاتا ہو مگر بدل اُسکا سلیس و فصیح موجود ہو جیسے کڑاڈا اور سنسناہٹ ثقیل ہونے سے قابل ترک ہے اور لگارسنسی سلیس ہے اسلیے لائق استعمال ہے لیکن جب لفظ کا بدل نہ ملے وہ نہ ثقیل ہے نہ لائق ترک جیسے اُڑا۔ گڈا وغیرہ۔

کریہ وہ لفظ ہے جو عوام بولتے ہوں اور خواص اُس سے احتراز کرتے ہوں جیسے جھاڑ۔ لبا۔ لپوٹا۔ خاص شہدوں اور لنگاروں کی اصطلاحیں ہیں تھیچر کسی خاص طبقہ کی اصطلاح نہیں لہذا قابل استعمال ہے۔

غریب وہ لفظ ہے کہ بدل اُسکا بولا جاتا ہو اور وہ خود کبھی زبانوں پر نہ آتا ہو جیسے ابر و میغ بھین اور جھاگ میں لفظ دوم بولا نہیں جاتا لہذا غریب اور لائق ترک ہے۔

تعریف زائد

زائد وہ لفظ یا جزو لفظ ہے جسکے استعمال کا کوئی فائدہ نہ ہو جیسے کدھر کو میں

پیروں فصیح ہے لہذا "کر" قابلِ ترک ہے نہ "پیر" کہ دونوں کا ترک بے محل مخلِ فصاحت ہے۔

(۳) ہر طبقہ کی زبان کے خاص الفاظ کا استعمال یوں درست نہیں مگر نقل قول کے وقت اُنکا استعمال صحیح کیا کہ بلیغ ہے جیسے ؎

یوں پکاریں ہیں مجھے کوچۂ جاناں والے
اِدھر آبے ابے او چاک گریباں والے

مصرعِ ثانی نقل قول ہے اُن بازاریوں کا جنکی بیہودگی کا ایک مہذب عاشق کو شکوہ ہے۔

تنقیح اجزائے زبان

داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نقطہ مقامے دارد

اُردو زبان جس طرح مختلف قوموں کے تعلقات سے اُنکی گفتگو کے لیے ایک نئی وضع کی مشترک زبان بن گئی ہے اُسی طرح اُس کے مختلف الوضع الفاظ کی باہمی موانست[1] بھی اُن اصول استعمال پر منحصر ہے جو ایک حد تک اسی زبان سے خصوصیت رکھتے ہیں۔

ہر بحث میں اگرچہ پہلی چیز معنی اور دوسری چیز لفظ ہے مگر ابتدا ذکر لفظ ہی سے ہوا کرتی ہے کہ وہی اظہار معنی کے لیے ایک علامت ہے۔ سلسلۂ کلام میں تمام کلمات کی باہمی چسپیدگی[2] دو چیزوں پر موقوف ہے

[1] موانست کی تعریف صفحہ ۲۸ میں دیکھیے۔

[2] کلمات کی باہمی چسپیدگی سے یہ مراد ہے کہ کلام میں الفاظ کی ترتیب ایسی ہو کہ ہر لفظ سے متکلم کا مطلب واضح ہوتا چلا جائے اور کلام کانوں کو خوشگوار معلوم ہو۔ ہر لفظ اپنے معنی اور آواز دونوں کے اعتبار سے مناسب محل ہو کسی حیثیت سے بے جوڑ اور بے محل نہو۔

(۱) ربط معنوی (۲) موافقت لفظی

بحث ربط معنوی

ربط معنوی[1] اُس علاقۂ ترتیب کلمات کا نام ہے جس پر اظہار معنی ارادی

[1] ربط معنوی۔ کلام سے متکلم کا مقصد کسی سلسلۂ خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ اسلیے وہ کلام کرتے وقت زبان کے بے شمار الفاظ میں سے اپنے ہر خیال کے لیے ایک لفظ منتخب کرتا ہے اور اُن لفظوں کو اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ جس سلسلے سے وہ خیالات اُسکے دماغ میں موجود ہیں اسی سلسلے سے سامع تک پہونچ جائیں۔ الفاظ کو اسطرح ترتیب دینے سے جو علاقہ ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے پیدا ہو جاتا ہے اُسی کا نام ربط معنوی ہے۔ پس اگر متکلم نے اپنے خیالوں کے لیے صحیح لفظ منتخب نہ کیے یا لفظوں کی ترتیب ایسی نہ دی کہ اُسکا مفہوم سمجھ سکے تو اُس کا کلام ربط معنوی سے خالی ہوگا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھے کہ اگر کسی کو یہ سلسلۂ خیالات اُردو زبان میں ادا کرنا ہو کہ "شیر آدمی کو کھا جاتا ہے" تو اُس کو اُردو۔ کے بے شمار الفاظ میں سے یہ چار لفظ منتخب کرنا چاہیے "شیر۔ آدمی۔ کو۔ کھا جاتا ہے" اور ان کو اسی ترتیب سے کہنا چاہیے اگر اُسنے ایسا کیا تو اُسکے کلام میں ربط معنوی ہے اور اگر انتخاب الفاظ میں غلطی کی تو ربط معنوی نہوگا۔ مثلاً جس جانور کا تصور اُسکے ذہن میں تھا اُسکے لیے اُردو میں شیر کا لفظ ہے اگر وہ اُسکی جگہ بیر کا لفظ استعمال کرے اور (بقیہ نوٹ صفحہ ۳۰ پر)

کا انحصار ہے وہ ربط کہیں ترکیب ہندی کے ساتھ ہوتا ہے کہیں ترکیب فارسی کے ساتھ۔ ترتیب کلمات کے وقت ہر لفظ میں دو حالتوں کو دیکھنا چاہیے۔ (۱) جنسیت لفظ یعنی وہ ہندی ہے یا فارسی یا عربی۔ یا اُن میں سے کسی ایک کے حکم میں ہے۔ (۲) حیثیت لفظ

جنسیت لفظ

بحث جنسیت الفاظ میں ربط معنی کے وقت اگر دو لفظ ایک زبان کے ہیں تو ہمجنس اور مختلف ہیں تو غیر جنس۔ اور ایک دوسرے کے حکم میں ہیں مثلاً ہندی اور اُردو تو داخل جنس اور اگر دونوں طرف لگاؤ رکھتے ہیں مثلاً ہند تو شریک جنس اور اگر نیا دو زبان کے پیشتر سے ایک دوسرے کے زیر اثر ہیں مثلاً عربی الفاظ فارسی کے ساتھ تو شامل جنس کے نام سے ذکر کیے جائینگے

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) یہ کہے کہ "بیر آدمی کو کھا جاتا ہے" تو اُسکے کلام میں ربط معنوی نہوگا۔ یا اگر الفاظ مناسب تو منتخب کرے مگر ترتیب صحیح نہو مثلاً "شیر کی جگہ پر آدمی" اور آدمی کی جگہ پر شیر رکھدے اور کہے کہ "آدمی شیر کو کھا جاتا ہے" یا انھیں لفظوں کو یوں ترتیب دے "کھا جاتا ہے کو شیر آدمی" تو بھی اُسکا کلام ربط معنوی سے خالی ہوگا۔ ان مثالوں سے واضح ہو گیا کہ ربط معنوی میں خلل پڑنے سے کلام یا مراد قائل کے خلاف ہو جاتا ہے یا مہمل۔ بہرحال معنی ارادی اُس سے ظاہر نہیں ہوتے۔

حیثیت لفظ

لفظ کسی جنس سے ہو دو حیثیتوں سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا یہ کہ وہ عادۃً زبان پر آتا ہو جیسے فصیح اسے معتدل کہینگے کہ اسی قسم لفظ سے دائرہ اعتدالِ زبان قائم ہے[1]۔ دوسرے وہ کہ اُسکے بولنے میں ارادہ شریک ہو جیسے سحر یہ غیر معتدل کے نام سے موسوم ہوگا[2]۔

معتدل الفاظ ہندی ہوں یا غیر ہندی مفرد ہوں یا مرکب زبان کے اجزائے ذات ہیں اور انھیں سے دائرہ اعتدال زبان قائم ہوا ہے اور غیر معتدل سے دائرہ زبان تزئین کے ساتھ وسیع ہوا ہے۔

الفاظ کی تفریق خود ظاہر کر رہی ہے کہ انکا باہمی ربط بھی ایک طرح کا نہیں ہو سکتا لہذا خصوصیات ترکیب ہندی و فارسی کا ذکر بھی ضروری ٹھہرا کہ کون سی ترکیب کس محل پر ناجائز۔ کہاں جائز۔ کہاں واجب اور

[1] جو الفاظ عادۃً زبان سے نکلتے ہیں ان کے استعمال سے عبارت خوش آئند اور دلنشیں معلوم ہوتی ہے اور اپنے مزاج کے اعتبار سے حد اعتدال کے اندر رہتی ہے اسی لیے مصنف نے ان لفظوں کو معتدل کہا ہے۔

[2] اسلئے کہ ایسے لفظوں کو انفراداً استعمال کرنے سے زبان کے مزاج میں اعتدال باقی نہیں رہتا

کہاں مستحسن ہے۔

خصوصیات ترکیب ہندی و فارسی

ترکیب ہندی تمام الفاظ میں بلا امتیاز جنس عام ہے۔ جسکے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی کہ اُردو کی ترکیب اصلی یہی ہے لیکن قسم غیر معتدل میں سوا خاص حالتوں کے جو اپنے محل پر بیان ہونگی ترکیب ہندی درست نہیں ترکیب فارسی کلمات غیر ہندی سے مخصوص ہے۔ جو بعض لفظوں میں ناجائز[1]۔ بعض میں جائز[2]۔ بعض میں ضروری[3] اور بعض میں مستحسن[4] ہے۔

[1] جن غیر ہندی الفاظ کی صورت اُردو میں بدل گئی ہے ان میں ترکیب فارسی ناجائز ہے۔

[2] زیادہ تر غیر ہندی الفاظ ایسے ہی ہیں کہ انکو فارسی ترکیب کے ساتھ بھی استعمال کر سکتے ہیں اور ہندی ترکیب کے ساتھ بھی مگر ہندی ترکیب کو اُردو میں فارسی ترکیب پر ترجیح ہے اسلیے مصنف نے ان لفظوں میں ترکیب فارسی کو صرف جائز قرار دیا ہے۔

[3] جو الفاظ غیر ہندی انفراداً اُردو میں مستعمل نہیں ہیں اُن کو ترکیب فارسی کے ساتھ استعمال کرنا ضروری ہے۔

[4] بعض غیر ہندی الفاظ ایسے ہیں کہ ان میں ترکیب فارسی ترکیب ہندی سے زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔

کلمات غیر معتدل ہیں فارسی ہوں یا عربی۔ ترکیب فارسی ضروری ہے۔ کہ یہ دائرۂ زبان کے بیرونی الفاظ ہر جگہ کلمات ہندی سے مانوس ہیں نہ ترکیب ہندی کو قبول کرتے ہیں اس لیے ان کا ربط[1] ترکیب فارسی کے ساتھ لازمی ٹھہرا۔ جس کی حد مداخلت[2]

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) دونوں تبدیل معنی کے ساتھ مستعمل ہوئے ہیں اسلیے ہند معنوی ہیں مصنف کی رائے میں ایسے لفظوں میں ترکیب فارسی جائز ہے لیکن ہند صوری یعنی ایسے لفظ جن کی صورت بدل گئی ہے اُن میں ترکیب فارسی جائز نہیں۔

[1] اُن کا اشارہ الفاظ غیر معتدل کی طرف ہے۔

[2] ترکیب فارسی کو اُردو زبان میں زیادہ سے زیادہ اتنا دخل ہے کہ کوئی مرکب تام الفاظ غیر ہندی سے بنالیا جائے۔ اُردو میں ترکیب فارسی کے لیے یہ حد معین ہے اگر اس حد سے تجاوز کیا جائیگا تو عبارت اُردو نہ رہیگی اُردو میں کوئی جملہ ایسا نہیں بن سکتا جس کے کل اجزا غیر ہندی ہوں۔ کم سے کم فعل یا حرف ربط ضرور ہندی ہوگا غالب کا یہ شعر ہے

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

اس بات کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان دونوں شعروں کے (بقیہ نوٹ صفحہ ۶۸ پر ملاحظہ ہو)

مرکب ناقص[1] ہے کیونکہ اُردو کا کوئی جملہ بغیر شرکت لفظ ہندی نہیں بنتا۔

بعض الفاظ ایک معنی میں معتدل ہیں اور دوسرے معنی میں غیر معتدل جیسے منت بمعنی خوشامد معتدل اور بمعنی احسان غیر معتدل ہے لہذا لفظ جس معنی میں مستعمل ہو اُسی کے موافق اسکی ترکیب بھی ہونا ضروری ہے کیونکہ خلاف اسکے یا غیر مانوس ہوجائیگا یا غلط فہمی پیدا کریگا مثلاً کوئی کہے کہ میں نے منت کی تو سننے والا سمجھے گا کہ التجا کی نہ کہ احسان کیا اور اگر کہے کہ میں منت پذیر ہوا تو سمجھا جائیگا کہ احسان مانا نہ کہ التجا قبول کی۔

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) دونوں مصرعے ایسے جملے ہیں جن میں سوا فعل "آیا" اور حرف ربط "تھا" کے باقی تمام الفاظ غیر ہندی ترکیب فارسی کے ساتھ آئے ہیں۔ اگر کسی عبارت میں ترکیب فارسی کو اس حد تک دخل ہو تو بھی وہ عبارت اُردو رہیگی البتہ اسکی فصاحت میں کلام ہوگا لیکن اگر افعال و روابط بھی فارسی یا غیر ہندی ہونگے تو عبارت اُردو نہ رہیگی چنانچہ اگر غالب کے انہیں مصرعوں میں "آیا" کی جگہ "آمد" اور "تھا" کی جگہ "بود" لکھ دیا جائے تو یہ چاروں مصرعے فارسی کے جملے ہوجائیں

[1] علم نحو کی اصطلاح میں مرکب ناقص ایسے مجموعۂ الفاظ کو کہتے ہیں جس میں کوئی فعل یا حرف ربط نہ ہو مثلاً "مزدور نے دیوار" "ایک تربوزہ" "دو خربوزے" "نوکری" "سید احمد کا قلم"۔ مرکب ناقص میں فعل یا حرف ربط شامل کر دینے سے جملہ بن جاتا ہے۔

توالی اضافات کے وقت بھی اگر ترکیب فارسی کا امکان ہو تو مستحسن ہے مثلاً "دل کی بیتابی کی حالت" کہنے سے "بیتابی دل کی حالت" کہنا فصیح ہے۔

ترکیب عربی کو اُردو میں مطلقاً دخل نہیں کہ الفاظ عربی خود ہی قواعد ہندی و فارسی کا عمل قبول کرتے رہتے ہیں جیسے امکان کی حد۔ حور اور غلمان یا حدامکاں۔ حور و غلماں[1] وغیرہ۔ افراد عربی میں اگر ترکیب عربی ہے تو سمجھو کہ مرکب اصل زبان سے بجنسہٖ لیا گیا ہے[2] مثلاً لیلۃ القدر، دار القرار وغیرہ

---

[1] حدامکاں۔ اس مرکب کے دونوں جزو عربی لفظ ہیں مگر فارسی کی ترکیب اضافی کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں اسی طرح ہندی کی ترکیب اضافی بھی ان کے لیے جائز ہے یعنی امکان کی حد کہنا بھی صحیح ہے یہی حالت حور و غلماں کی ہے کہ عربی لفظ فارسی کی ترکیب عطفی کے ساتھ آئے ہیں اور اُردو کی ترکیب عطفی کے ساتھ یعنی حور اور غلمان کہنا بھی صحیح ہے۔

[2] عربی کے بعض مرکبات اُردو زبان میں مستعمل ضرور ہیں مگر الفاظ کو باہم ترکیب دینے کا جو قاعدہ عربی میں ہے وہ اُردو میں نہیں ہے یعنی اُردو میں مرکبات عربی کو استعمال ہوتے ہوئے دیکھ کر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم اور لفظوں کو بھی اسی طرح ترکیب دیکر اُردو میں استعمال کر سکتے ہیں۔

بیت ترکیبی میں اُردو کے لیے حکم مفرد میں ہیں۔ اور افراد ان کے داخل ناقصات ہیں لہٰذا قاعدہ عربی غیر عربی پر جاری کرنا درست نہیں مثلاً "بے پروائی کی جگہ لاپروائی۔ ناچاری کی جگہ لاچار۔ یگانگی کی جگہ یگانگت" بولنا صحیح نہیں ہے۔

اس بحث میں مفردات اپنی جگہ کے لیے ہیں اور مرکبات اپنی جگہ کے لیے اور مقصد دونوں کا تکمیل معنی ارادی اور حُسن ادائے مفہوم ہے مثلاً غالبؔ کہتے ہیں ؎

جب وہ جمال دل فروز، صورت مہر نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردہ میں منہ چھپائے کیوں

شعر مذکور میں دل فروز، نیمروز، نظارہ سوز جس خوبی سے اپنے اپنے مفہوم کو ادا کر رہے ہیں اُس میں مفردات کی عاجزی محتاج بیان نہیں۔ اور مفردات کے محل پر مرکبات کی عاجزی بھی اسی جگہ نمایاں ہے۔ الحاصل اس بحث کو اسی قدر سمجھ لینا کافی ہے کہ ربط کس طرح کا ہے اور معنی ارادی حُسن کے ساتھ کس لفظ سے حاصل ہوتے ہیں۔

بحث موانست لفظی

موانست لفظی ربط معنوی کے زیر اثر تعلقات الفاظ کا وہ خوشگوار نتیجہ ہے جس پر فصاحت کلام کا دار و مدار ہے۔ تمام الفاظ کے فرق نوعی[1] اور خصوصیات ترکیبی[2] کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر استعمال لفظ صحیح ہوگا۔ مگر بعض الفاظ کے لیے استعمال صحیح کا فصیح ہونا ضروری نہیں کیونکہ فصاحت کلام اصول موانست پر مبنی ہے۔ لہذا قبل بیان اُصول لفظ و معنی کی مشترکہ حالتوں[3] کا ذکر ضروری ہے کہ امتیاز قسم لفظ میں آسانی ہو۔

اقسام الفاظ باعتبار انفراد و تعدد صورت و معنی

جو الفاظ لائق اظہار معنی[4] ہیں وہ تین حالتیں رکھتے ہیں:۔

---

[1] یعنی کوئی لفظ منفرد ہے یا مترادف۔ ہندی ہے یا غیر ہندی۔ مفرد ہے یا مرکب۔

[2] یعنی اس لفظ کے ساتھ ترکیب ہندی جائز ہے یا واجب۔ یا ترکیب فارسی جائز ہے یا واجب۔

[3] لفظ و معنی کی مشترکہ حالتیں۔ یعنی الفاظ اور اُن کے معنی دونوں پر مشترکہ حیثیت سے نظر کرنے سے الفاظ کی جتنی حالتیں ہو سکتی ہیں۔

[4] جو الفاظ بذات خود بغیر کسی دوسرے لفظ کی مدد کے (بقیہ نوٹ صفحہ ۷۲ پر ملاحظہ ہو)

(۱) صورت و معنی دونوں میں ایک ہونا۔ جیسے نقاب کہ نہ اس لفظ کے کچھ اور معنی ہیں نہ اس معنی کا کوئی اور لفظ ہے۔

(۲) صورتیں کئی معنی میں ایک ہونا جیسے بادل۔ ابر۔ سحاب۔ کہ سب کا ایک ہی مفہوم ہے۔

(۳) صورت ایک معنی کئی ہونا۔ جیسے قلم جسکے ایک معنی آلہ تحریر۔ دوسرے وہ پتلی اور لانبی شیشی جس میں عطر و شراب وغیرہ رکھتے ہیں تیسرے وہ شاخ جس سے درخت کی بنیاد ہو۔

معمائے قلم از مصنف

کام ہوں تین وہ اک چیز اٹھاؤ ‏ ‏ ‏ ‏ خط لکھو جام پیو باغ لگاؤ

اقسام مذکور میں سے اوّل کو منفرد دوم کو مترادف۔ سوم کو مشترک کہتے ہیں۔

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) کچھ معنی رکھتے ہیں جیسے۔ وکیل۔ شعر۔ کھجور۔ بخلاف اُن الفاظ کے جو بغیر کسی لفظ سے ملے ہوئے کچھ معنی نہیں رکھتے جیسے۔ کہ۔ پوش۔ ٹپا۔ بھال۔ کہ جب اُن لفظوں کے ساتھ کچھ لفظ اور شامل کیے جائیں تو کچھ معنی نکلتے ہیں مثلاً کمکہ۔ ہنا کنا۔ دیکھ بھال مصنف نے پہلی قسم کی لفظوں کو مفردات تامہ اور دوسری قسم کی لفظوں کو اجزائے ناقصہ کہا ہے۔

استعمال منفرد کے لیے صرف ربط معنوی کافی ہے[1] کہ وہی موافقت
لفظی کا بھی ضامن ہے لیکن مترادفات کے لیے کافی نہیں کہ باعتبار معنی
تو وہ جتنے ہوں ایک کے حکم میں ہیں لیکن بلحاظ جنسیت وحیثیت اُن
میں بہت کچھ فرق ہے[2] جس سے ہر لفظ کے لیے محل خاص اور ہر محل کیلیے

---

[1] ظاہر ہے کہ جب کسی معنی کے لیے زبان میں ایک ہی لفظ ہے تو اسکے استعمال کے لیے صرف ربط معنوی کا لحاظ کافی ہے یعنی اگر اُس سے معنی ارادی ظاہر ہوتے ہیں تو اسکا استعمال صحیح اور برمحل ہے ایسے لفظ موافقت لفظی کی بحث سے خارج ہیں اسلیے کہ اگر ان میں اصول موافقت کے لحاظ سے کوئی نقص بھی ہو مثلاً اُن کی آواز کریہ ہو یا اُن کا تلفظ مشکل ہو تو بغیر اُن کے استعمال کے چارہ نہیں کیونکہ اُردو میں اُن کے معنی کا کوئی دوسرا لفظ موجود نہیں۔

[2] جو الفاظ ہم معنی ہیں اُن میں بھی بعض اعتبارات سے فرق ہوتا ہے یعنی ایک لفظ کے ساتھ ایک طرح کے خیالات وابستہ ہو جاتے ہیں دوسرے لفظ کے ساتھ دوسری طرح کے۔ ایک لفظ ذہن کو کسی طرف منتقل کرتا ہے دوسرا کسی اور طرف۔ ایک لفظ سے ایک اثر پیدا ہوتا ہے دوسرے سے دوسرا۔ ایک ہی مفہوم کے لیے دو لفظ ہیں مگر ایک سے حقارت نکلتی ہے دوسرے سے عزت۔ ایک، ذلیلوں اور جاہلوں کی زبان پر جاری ہے دوسرا شریفوں اور عالموں کی زبان سے مخصوص ہے۔ ایک ہی عضو کے دو نام ہیں ایک فحش ہے دوسرا بڑے بڑے ثقہ لوگ (بقیہ نوٹ صفحہ ۷۴ پر ملاحظہ ہو)

لفظ مخصوص ہے ورنہ مترادفات کا وجود ہی بے سود تھا اور لفظ مشترک معنی
غیر مشترک[1] میں قائم مقام منفرد اور معنی مشترک[2] میں قائم مقام مترادف
ہونے سے ایک لفظ دو طرف تقسیم ہو کر تین قسموں کی دو ہی[3] رہ جاتی ہیں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۷۳) بھی استعمال کرتے ہیں۔ غرض اس طرح کے نہ معلوم کتنے معنوی فرق ہیں جو مترادف الفاظ میں موجود ہیں ان کے علاوہ صوری فرق بھی ہوتے ہیں کسی لفظ کی آواز نرم اور شیریں ہے کسی کی سخت اور کرخت۔ اسلیے دو ہم معنی لفظوں میں سے ایک کا استعمال ایک موقع پر مناسب ہے دوسرے کا دوسرے موقع پر۔ ماخذ کے اعتبار سے بھی ان میں فرق ہوتا ہے۔ ایک عربی ہے دوسرا فارسی۔ ایک ہندی ہے دوسرا انگریزی۔ ان سب فرقوں پر نظر کرنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ الفاظ مترادف کے استعمال برمحل کے لیے کچھ اصول ہونا چاہیے یہی اصول مصنف نے پہلے پہل بنائے ہیں۔

[1] یعنی وہ معنی جو اُس لفظ کے لیے مخصوص ہیں اور جن میں کوئی اور لفظ اسکا شریک نہیں۔

[2] یعنی وہ معنی جو اُس لفظ کے سوا کسی دوسرے لفظ میں بھی پائے جاتے ہیں۔

[3] مصنف کا مطلب ہے کہ لفظ کے استعمال برمحل کی بحث میں الفاظ مشترک کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتے جب کلام میں وہ ایسے معنی دیں جو کسی اور لفظ میں نہیں پائے جاتے تو ان کی حیثیت الفاظ منفرد کی سی ہوگی کیونکہ (بقیہ نوٹ صفحہ ۷۵ پر)

اور وہ معنی ایسے ہی ہونگے جس معنی کا کوئی دوسرا لفظ بھی موجود ہو لہذا مترادف مستعار[1] کے نام سے موسوم ہوگا۔ اب مترادف دو طرح کے ہوئے (۱) مستقل (۲) مستعار۔ جن میں مترادفات مستعار کا استعمال مستقل اور سماعی ہے اور مترادفات مستقل کا استعمال غیر مستقل اور قیاسی ہے۔ قسم اول[2] میں دلالت استعمال شیوۂ اہل زبان[3] ہے اور قسم دوم میں قواعد موضوعہ

[1] کوئی لفظ اپنے معنی مستقل کے اعتبار سے منفرد ہو یا مترادف مگر جب وہ کسی معنی مستعار میں مستعمل ہوگا لفظ مشترک کے حکم میں آجائیگا کیونکہ معنی مستقل کے علاوہ اس میں ایک معنی اور پیدا ہوگئے اور جب کسی لفظ کے معنی ایک سے زیادہ ہونگے تو وہ لفظ مشترک سمجھا جائیگا۔ لیکن چونکہ بحث استعمال لفظ میں ہے۔ لفظ مشترک کبھی منفرد کی حیثیت رکھتا ہے اور کبھی مترادف کی جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا۔ لہذا اگر وہ منفرد کی حیثیت میں ہو تو اُسکے استعمال برمحل کے لیے ربط معنوی کا لحاظ کافی ہے اور اگر مترادف کی حیثیت رکھتا ہو تو جو اُصول استعمال مترادف کے لیے بیان کیے جائینگے وہی ان مترادفات مستعار پر بھی صادق آئینگے۔

[2] یعنی اس بات کی دلیل کہ لفظ کا استعمال صحیح اور برمحل ہوا یا نہیں۔

[3] جن الفاظ کا استعمال مقرر ہے اُن کے صحیح یا غلط، برمحل یا بے محل استعمال کی دلیل صرف یہی ہے کہ اہل زبان اُنھیں اس طرح استعمال کرتے ہیں یا نہیں۔

جن میں قسم اول کا استعمال بے خدشہ ہے لیکن قسم دوم کا استعمال بغیر دلالت استعمال مخدوش ہے۔

اور ایک حالت معنی مستعار ہے جس کیلیے لفظ علیحدہ نہیں۔ بلکہ انھیں اقسام مذکور میں سے کوئی لفظ اپنے معنی مقررہ کے خلاف کسی فرضی معنی میں مستعمل ہوجاتا ہے[1]۔ جیسے میٹھا درد یعنی درد خفیف اسی کو علم معانی میں معنی مجازی کہتے ہیں مگر ہم اپنی اصطلاح میں معنی ترکیبی کہینگے۔ کیونکہ یہاں موضوع بحث معنی لفظ نہیں بلکہ حالت استعمال لفظ ہے جو نئے معنی کے اظہار کا سبب ہوتی ہے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) منفرد ایسے ہی لفظ ہوتے ہیں کہ اُن کے معنی میں کوئی اور لفظ شریک نہیں ہوتا اور جب وہ ایسے معنی دیں جو کسی اور لفظ سے بھی ادا ہوسکتے ہیں تو اُس وقت اُنکی حیثیت الفاظ مترادف کی سی ہے کیونکہ اس وقت ایک ہی مفہوم کے لیے ایک سے زیادہ لفظ موجود ہیں۔ اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینا چاہیے کہ مشترک مستعار بھی بحث استعمال الفاظ میں انھیں دو قسموں پر منقسم ہوجائیں گے اور منفرد مستعار یا مترادف مستعار کہلائیں گے۔

[1] یعنی الفاظ کے معنی کی دو حالتیں ہیں ایک معنی مستقل دوسرے معنی مستعار۔

استعمال سماعی

وہ استعمال لفظ ہے جس کی مقررہ صورتوں میں مترادفات بھی مثلِ منفردات کے ہر جگہ مستقل نظر آتے ہیں[1]۔ اس بحث میں استقلال لفظ کی دو ہی علامتیں پائی جاتی ہیں (۱) لفظ کا معنی اصلی سے عدول کر کے کسی نئے معنی میں مستعمل ہونا جیسے کچی لکڑی بمعنی نوعمر ناتجربہ کار۔ اس مثال میں ہر دو افراد معنی اصلی سے عدول کر گئے ہیں اور نئے معنی ان کی باہمی وابستگی سے پیدا ہوئے ہیں لہذا دونوں اپنی اپنی جگہ مستقل اور ایک دوسرے کے لیے معین معنی[2] ہے

[1] بعض محلوں کے لیے بعض لفظ مخصوص ہیں کہ گو ان کے ہم معنی دوسرے لفظ زبان میں موجود ہیں مگر وہ ان مخصوص لفظوں کی جگہ استعمال نہیں کیے جا سکتے جس طرح الفاظ منفرد میں ایک کی جگہ دوسرا نہیں لے سکتا۔

[2] اس مثال میں "کچی" اور "لکڑی" دونوں کے ہم معنی "خام" اور "چوب" موجود ہیں لیکن خام لکڑی، کچی چوب، یا خام چوب جس طرح بھی بولا جائے فقرہ نہ صرف غیر فصیح ہو جائے گا بلکہ اس سے "نوعمر ناتجربہ کار" کے معنی ہی نہ نکلیں گے اس خاص معنی میں کچی لکڑی بھی ایک استعارہ ہے لیکن اس سے یہ سمجھنا چاہیے (بقیہ نوٹ صفحہ ۷۸ پر)

(۲) معنی اصلی پر قائم رہ کر اپنے استقلال سے معین معنی ہونا جیسے میٹھی نیند میں جزو دوم۔ اس اتحاد عمل میں ہر دو افراد کی صورت حال خود ان کے استعمال برمحل کا یقین ثبوت اور موافقت باہمی کی قوی شہادت ہے کیونکہ لفظ سے لفظ کی تبدیلی مرکب موضوع کو مہمل یا فصیح کو غیر فصیح بنا دیتی ہے مثلاً میٹھا خواب یا شیریں نیند۔ اسی طرح دل بجھنا۔ غم کھانا کی جگہ قلب بجھنا۔ صدمہ کھانا بولنا درست نہ ہوگا۔ یا میر انیس کے اس مصرع میں ع کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا۔ کھا کھا کے "شبنم" کہو تو ہرگز مانوس نہ ہوگا۔ الحاصل عدول معنی ہو یا اعانت معنی دونوں نشانات استقلال لفظ ہیں۔ ایسے افراد میں رد و بدل درست نہیں کہ خلاف شیوۂ اہل زبان ہے۔

مذکورۂ بالا ہر مقررہ صورت کو اصطلاح عام میں محاورہ کہتے ہیں لیکن وہ صورت استعمال جس میں قیاس کو دخل ہو اور الفاظ غیر معتدل سے پاک ہو محاورہ نہیں روزمرہ ہے جیسے رات کاٹنا محاورہ ہے اور رات گزارنا روزمرہ ہے یا یوں سمجھو کہ پاؤں پڑنا عاجزی کے معنی میں محاورہ اور پاؤں پر گرنے

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) کہ ہر استعارہ استعمال مقرر کی ایک شکل ہے البتہ وہ تمام استعارے جو کسی معین مفہوم کے لیے بالعموم استعمال ہوتے رہتے ہیں استعمال مقرر کے تحت میں آتے ہیں۔

کے معنی میں روزمرہ ہے۔ الغرض محاورہ وہ مرکب ہوا جس کی معنوی حالت میں قیاس کا دخل نہو اور روزمرہ وہ مرکب ہوا جو الفاظ غیر معتدل سے پاک اور کسی حیثیت سے خلاف قیاس نہو۔ محاورات میں ایسا تغیر جس سے اسکی اصلیت اس طرح بگڑ جائے کہ روزمرہ کی تعریف میں بھی نہ آئے ناجائز ہے اور نہ بگڑے تو جائز ہے اور حسن کلام بڑھ جائے تو مستحسن ہے

ناجائز تصرفات

لفظی تبدیلی۔ مثلاً غم کھانا۔ تھرتھرانا۔ محاورہ اور صدمہ کھانا۔ بنگ جانا خلاف محاورہ ہے۔

معنوی تبدیلی۔ آج کیا جاتی دنیا دیکھی۔ اُس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص خلاف توقع آجائے۔ مطلب یہ ہوا کہ آپکا آنا جس کی خواہش تھی اُمید نہ تھی کیونکر ہوا۔ اب اگر جاتی دنیا۔ کہکر گزرتا ہوا زمانہ مراد لیا جائے تو خلاف محاورہ ہے۔

جائز تصرفات

(۱) اضافہ حرف۔ فعل مثبت میں حرف نفی بڑھا دینا مثلاً

خدا ہی اس چپ کی داد دیگا کہ تیرے دم نے ڈالتے ہیں
اجل کے مارے ہوئے کسی سے نہ بولتے ہیں نہ چالتے ہیں

یہاں بول چال میں حرف نفی کے اضافہ سے ایسا تصرف ہوا جو لابدی تھا اور اسکی اصلیت پر کوئی تباہ کن اثر نہیں پڑا۔

(۲) اضافہ لفظ مثلاً

نبض بیمار جو لے رشکِ مسیحا دیکھی
آج کیا آپنے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

"ہوئی" جزو زاید ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ مگر غلط بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ہستی محاورہ کی برقرار ہے۔

(۳) تخفیف مثلاً

گل توڑنے پہ دیتی ہے دشنام عندلیب
سچ ہے کسی کا ہاتھ کسی کی زباں چلے

بولتے یوں ہیں کہ کسی کا ہاتھ چلے کسی کی زبان چلے۔ یہاں جزو زاید دور کر دینے سے نظم کے لیے گنجائش نکل آئی اور اصلیت بھی قائم رہی۔

(۴) جزو محاورہ استعمال کرکے کُل مراد لینا مثلاً ؎

اونسے دیکھا جو اُٹھ کے سوتے سے
اُڑ گئے ہاتھ کے طوطے سے — بیت

محاورہ یوں ہے کہ ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ مُصنّف نکتہ رس نے ایک ساکت چیز کی حالت تحیر کو متحرک شے سے مثال دیکر ناقابل اظہار مفہوم کو ظاہر کر دیا۔ درحقیقت یہ محاورہ میں تصرف لفظی نہیں بلکہ جزو سے کل کی طرف اشارہ مقصود ہے جسکو ”سے“ حرف تشبیہ ظاہر کر رہا ہے

تصرف مُستحسن

انیس فرماتے ہیں ؎

کودکی، پیری، جوانی دیکھ لی
تین دن کی زندگانی دیکھ لی

محاورہ میں دو دن یا چار دن کی زندگی ہے جس کا مفہوم قلت زمانہ ہے تعداد معینہ نہیں۔ مگر قادر الکلام مُصنّف تین زمانے ظاہر کرنے کے بعد تین دن کی زندگانی کہکر وہ معنی آفرینی کر رہا ہے جو اُسی کے لئے ہے کہ

محاورہ غلط ہونے کے بدلے نئے جامہ میں اگر دوسرا محاورہ بن گیا۔ محاورہ میں ایسا تصرف جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے۔

محاورہ کا حسن استعمال یہ ہے کہ ایک مفہوم اُسکے معنی معروف سے حاصل ہو اور دوسرا مفہوم الفاظ محاورہ کے لغوی معنی سے پیدا ہو جائے میرے ؎

آئینہ انکا ٹوٹ گیا میرے ہاتھ سے
اب کوئی منہ دکھانے کی صورت نہیں رہی

شعر کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کوئی امکان نہ رہا جس سے آئینہ ٹوٹنے کی شرمندگی رفع ہو سکے اور ایک معنی یہ بھی نکلتے ہیں کہ اب معشوق کو اُس کا مُنہ کیونکر دکھائیں جبکہ مُنہ دکھانے والی چیز ہی نہ رہی۔

جو مصدر ترکیبی معنی مجازی میں مستعمل ہیں اُنکا استعمال ہر فاعل و مفعول کے ساتھ درست ہے اور ازروے اشتقاق اُن سے جتنی شکلیں بن سکیں سب صحیح ہیں مثلاً ہوا ہو جانا جسکے معنی ”تیزی سے بھاگ کر نظر سے غائب ہو جانا“ ہیں اگر یوں کہیں کہ چور مال لے کے ہوا ہو گیا۔ یا یوں کہیں کہ کچا رنگ سے ہوا ہو جائے گا تو کسی طرح غلط نہیں۔

روزمرہ میں تصرفِ مستحسن

دمک اک خاص طرح کی تابندگی کا نام ہے جس کا استعمال ستارہ اور کندن وغیرہ کے ساتھ مخصوص ہے لیکن میر انیس کہتے ہیں کہ ع

مٹی میں وہ دمک تھی کہ کندن بھی گرد تھا

شاعر نکتہ رس مٹی سی کم حقیقت چیز کو کندن سی بیش قیمت شے پر ترجیح دینے کے لیے جو صفت کندن کی تھی اُسے مٹی کے ساتھ استعمال کرتا ہے اور "وہ" حرف ترقی لا کر بتاتا ہے کہ مٹی کی چمک کندن کو مات کر رہی تھی اور لفظ گرد جو مٹی کے لیے وضع ہوا تھا مات کی جگہ صرف کر کے مٹی کو سونا اور سونے کو مٹی بنائے دیتا ہے۔ اگر مصنف موصوف نے کندن کی صفت مٹی کے ساتھ لا کر مٹی کی صفت کندن کے ساتھ نہ استعمال کی ہوتی تو جملہ بے معنی یا غیر فصیح ہو جاتا۔ مقررہ استعمال پر ایسی دست اندازی انھیں قادر الکلام شعرا کا حق ہے جو اسے مہملیت سے بچا کر معنی کی نئی روح پھونک سکتے ہیں۔ نااہل ایسی جرات کر کے ہمیشہ منہ کی کھاتے ہیں۔ جس کی بہت مثالیں دیکھنے میں آیا کرتی ہیں۔

استعمال قیاسی

استعمال قیاسی وہ استعمال لفظ ہے جس کی غیر مقررہ[1] صورتوں میں ہر قسم[2] مترادف کے لیے جگہ علیحدہ ہے کہ ایک کے مقام پر دوسرا فصیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس بحث میں چار چیزیں قابل لحاظ ہیں (۱) امتیازات لفظ (۲) مناسبات باہمی (۳) محل استعمال (۴) دلالت استعمال

امتیازات لفظ

قبل استعمال دیکھ لینا چاہیے کہ لفظ بجائے خود منفرد ہے یا مترادف؟

[1] استعمال سماعی میں لفظ کو مقررہ صورتوں کے علاوہ کسی جگہ صرف کرنا فصاحت کے خلاف ہوتا ہے لیکن استعمال قیاسی کے لیے صورتیں مقرر نہیں ہیں بلکہ قاعدے مقرر ہیں ان قاعدوں کی پابندی کے ساتھ الفاظ کا استعمال ہر جگہ صحیح ہے۔

[2] استعمال قیاسی کی بحث ہر قسم کے مترادف الفاظ کو حاوی ہے لیکن الفاظ منفرد اس تحت سے خارج ہیں کیونکہ لفظ منفرد ایک مفہوم کے لیے ایک ہی ہوتا ہے اور اسلیے اس کا استعمال کسی قاعدے کا پابند نہیں ہو سکتا۔ الفاظ مترادف میں البتہ اس کا امکان ہے کہ کسی محل کی مناسبت سے ایک لفظ کو ترک کر کے اس کا ہم معنی دوسرا لفظ لے آئیں۔

معتدل غیر ہندی بھی فصیح معلوم ہوتا ہے[1]۔ برخلاف اسکے غیر معتدل الفاظ جو زیادہ تر غیر ہندی ہوتے ہیں سوا دساطت ہمجنس کے جنکے ساتھ ترکیب بھی فارسی کی لازم ہے لائق استعمال اُردو نہیں ہو سکتے۔ جیساکہ بحث ترکیب میں بیان ہو چکا۔

اس تشریح سے استعمال لفظ کے لیے دو "عام اصُول" قرار پاتے ہیں (۱) ترجیح درجہ اعتدال" یعنی جو لفظ معتدل تر ہے[2] وہی بلا امتیاز جنس فصیح ہے۔ (۲) "وساطت ہمجنس" یعنی جو لفظ فصیح نہیں وہ کسی لفظ ہمجنس کے ساتھ

---

[1] اعتدال لفظ میں جنس کو دخل نہیں ہے یعنی لفظ کا ہندی یا غیر ہندی ہونا اسکے معتدل یا غیر معتدل ہونیکی دلیل نہیں ہے۔ شرط اعتدال صرف یہ ہے کہ لفظ بغیر کسی شرط کے انفراداً اور ترکیباً ہر حالت میں کثرت سے استعمال ہوتا ہو۔

[2] تمام الفاظ "معتدل" درجہ اعتدال میں برابر نہیں ہوتے۔ جو لفظ جتنا زیادہ کثیر الاستعمال ہے اُتنا ہی زیادہ معتدل ہے جس طرح اعتدال لفظ کا تصفیہ جنس لفظ کی بنا پر نہیں ہوتا اسی طرح درجہ اعتدال کے تعین میں بھی جنس لفظ کو دخل نہیں ہے۔ مثلاً "وتار" اور "پگڑی"۔ "شب" اور "رات" میں الفاظ ہندی۔ اور "شاخ" اور "ڈالی"۔ "درد" اور "پیڑا" میں الفاظ غیر ہندی معتدل تر ہیں۔ اور "خون" اور "لہو"۔ "بستر" اور "بچھونا" میں الفاظ ہندی و غیر ہندی درجہ اعتدال میں برابر ہیں۔

"معتدل" ہے یا "غیر معتدل" اور ایک دوسرے کا "ہمجنس" ہے یا "غیر جنس"

"منفرد" بحث اعتدال و جنسیت دونوں سے مستثنےٰ ہے کہ وہ اپنی جگہ کے لیے آپ ہی ہے۔ مگر مترادف مستثنےٰ نہیں۔ وہ معتدل بھی ہو سکتا ہے "غیر معتدل" بھی "ہم جنس" بھی "غیر جنس" بھی۔ کہ مدارج و اقسام مقابلۃً قائم ہو سکتے ہیں اس فرق باہمی سے ہر ایک کیلیے جگہ علیحدہ ہے ورنہ مترادفات کا وجود ہی بے سود تھا۔

معتدل الفاظ بلا امتیاز منفرد و مترادف اُردو کے اجزائے ذات ہیں۔ اور ان کے استعمال کی ترکیب اصلی ترکیب ہندی ہے کہ "ہمارے" کے ساتھ افعال و حروف بھی کلیۃً ہندی کے موجود ہیں جن کے ساتھ

---

[1] لفظ منفرد کے استعمال میں اس بات کا لحاظ رکھنا ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنے گرد و پیش کے لفظوں سے مناسبت رکھتا ہے یا نہیں۔ اگر محل لفظ معتدل لانے کا ہو لیکن معنی مقصود ایسے لفظ منفرد سے ادا ہوتے ہیں جو غیر معتدل ہو تو بھی وہی لفظ لانا پڑیگا۔ اسی طرح اگر محل تابعیت جنس کا مقتضی ہو لیکن معنی مقصود کے لیے زبان میں صرف ایک ہی لفظ ہو اور وہ اپنے متعلق لفظ کا ہمجنس نہ ہو تو بھی مجبوراً وہی غیر جنس لفظ استعمال کرنا پڑے گا۔

ترکیب پاکر فصیح ہو جاتا ہے۔ یہ اصول عام اسلیے کہے گئے کہ مفردات کی کوئی قسم ان سے مستثنےٰ نہیں۔ خاص اصول کا تعلق مناسبات باہمی سے ہے جنکے زیر اثر صرف مترادفات مستعمل ہیں۔

مناسبات باہمی

مناسبت[1] اُس لگاؤ کا نام ہے جسکے اقتضائے حال سے ایک لفظ دوسرے کے ساتھ مانوس نظر آتا ہے اس لگاؤ کی تین قسمیں ہیں معنوی۔ لفظی[2]۔ ترکیبی[3]۔

معنوی مناسبتیں دو ہیں (۱) اشتمال معنی (۲) تقابل معنی۔ اشتمال معنی سے یہ

[1] بالعموم مناسبت الفاظ اور رعایت لفظی کا مفہوم ایک سمجھا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں دونوں میں بڑا فرق ہے۔ رعایت لفظی میں الفاظ کے معنوی تعلق کا اعتبار ہوتا ہے جیسے کسی جملہ میں یوسف کی رعایت سے زنداں۔ عزیز۔ مصر کنعاں وغیرہ لانا۔ یا بلبل کی رعایت سے گلشن۔ قفس۔ آشیانہ۔ صیّاد وغیرہ اور مناسبت الفاظ سے مصنف نے الفاظ کے وہ باہمی تعلقات مراد لیے ہیں جو معنوی تعلق کے علاوہ ہیں۔ اور یہ بتایا ہے کہ لفظوں کے انتخاب اور ترتیب میں معنی کے علاوہ اُن کی کن کن حیثیتوں اور خصوصیتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

کہ ایک لفظ دوسرے کے ساتھ کسی حیثیت سے شامل ہو حیثیتیں دو ہیں (۱) شامل ذات (۲) شامل حال۔

شامل ذات یہ ہے کہ ایک لفظ دوسرے کا جزو ذات ہو۔ جیسے لہو کی بوند۔ یا جز و صفت ہو جیسے لہو کی لالی۔

شامل حال یہ ہے کہ دونوں کسی ایک ذات یا نوع سے ایک طرح کا علاقہ رکھتے ہوں۔ جیسے کڑوا۔ کیلا۔ کالا۔ پیلا۔ اسمار صفات ہیں۔ یا پھول۔ پھل اجزائے درخت اور ہاتھ منہ اعضائے حیوان ہیں۔ یا جھگڑا "جھگڑا و لڑائی" جھگڑا دونوں ایک ہی معنی کا فائدہ دیتے ہیں۔ یا سورج۔ چاند۔ تارے۔ وغیرہ اور تمام پرند۔ تمام چرند۔ تمام درندے۔ تمام گزندے ایک دوسرے کے ساتھ شامل نوع ہیں۔ یا تمام اسمار اعداد دو۔ تین۔ چار وغیرہ بھی اسی قبیل سے ہیں۔ غرضکہ کوئی ایسا لفظ جو کسی حیثیت میں دوسرے کا شامل حال ہو نسبت اشتمال کے زیر اثر سمجھا جائیگا

تقابل معنی یہ ہے کہ ایک لفظ دوسرے کا مخالف مقابل ہو جیسے آگ۔ پانی۔ دوست۔ دشمن۔ مشرق۔ مغرب وغیرہ۔

لفظی مناسبتیں بھی دو ہیں (۱) توازن تصریفی (۲) توازن صوری

توازن تصریفی کے اعتبار دو ہیں (۱) مادی (۲) وضعی۔

توازن مادی یہ ہے کہ مشتقات کا ماخذ ایک ہی مادہ یا ایک ہی مصدر ہو جیسے قاتل۔ مقتول۔ مقتل کہ مادہ سب کا قتل ہی ہے۔ بالشندہ اور کشتہ کہ دونوں مصدر کشتن سے مشتق ہوئے ہیں۔

توازن وضعی یہ ہے کہ دونوں اصطلاح صرف میں ایک ہی کہے جاتے ہوں جیسے۔ قاتل۔ سائل۔ اسم فاعل، مقبول مجروح۔ اسم مفعول، نغمے فقرے اسم حالت جمع، اقرار۔ انکار مصدر۔

توازن صوری یہ ہے کہ ایک لفظ دوسرے سے حرکات میں مثل افاعیل کے یا حروف میں مثل قوافی کے۔ یا دونوں طرح مشابہ ہو۔ اس مشابہت کے دو درجے ہیں (۱) ناقص۔ (۲) تام جیسے رات۔ بات کام۔ کاج وغیرہ میں توازن ناقص ہے۔ اور نام۔ کام۔ قرار۔ فرار۔ میں توازن تام ہے۔

ترکیبی مناسبت۔ توازن ہیئت ہے جیسے دلفروز، غم اندوز۔ ہاتھ بل۔ زر بل وغیرہ مرکب مماثل[1] اور ایک دوسرے کے متوازن ہیں

---

[1] مرکب مماثل کی تعریف صفحہ ۷۰ میں دیکھیے۔

یا دست طلب، چشم کرم، آب سرد، نان گرم، پاس وحرماں، دین ایماں آنکھ کی بصارت، کان کی سماعت وغیرہ مرکب مغائر[1] ہیں۔ یہ بھی ہیئت ترکیبی میں باہمدگر متوازن ہیں۔

بس یہی مناسبتیں اصول خاص کی سات بنیادیں ہیں جن میں ہر مناسبت کا اقتضا کسی محل پر اتحاد جنس کا موید نظر آتا ہے اور کسی محل پر مساوات حال[2] کا اور یہی تائید دلالت استعمال کے لیے حق مداخلت کو وضع کرتی ہے جس کی تفصیل آگے آئیگی۔

محل استعمال

محل استعمال وہ جگہ ہے جہاں کی ضرورتوں کو لفظ ہر حیثیت سے پورا کر سکے ورنہ محل عجز ہے۔ ضرورتیں دو ہیں۔ جن میں پہلی چیز

---

[1] مرکب مغائر کی تعریف صفحہ ۷۰ میں دیکھیے۔

[2] مساوات حال کی دو صورتیں ہیں۔ ایک الفاظ کا درجہ اعتدال میں برابر ہونا یا صورت میں مشابہ ہونا۔ دوسرے مرکبات یا فقرات کا ہیئت ترکیبی میں یکساں ہونا۔

تبلیغ[1] معنی ہے جو ہر جگہ کیلیے ہے اور کوئی قسم لفظ اس سے مستثنٰے نہیں
اور دوسری چیز موانست لفظی ہے وہ اصول موضوعہ کے زیر اثر ہے جس کا
تعلق مترادفات و مرکبات سے ہے۔ لفظ منفرد کا محل وقوع محل مستقل ہے
اور مترادفات کا محل وقوع اگر کسی مناسبت کے زیر اثر نہیں ہے تو محل عند ال
ہے ورنہ محل مستعار ہے جو مناسبات معنوی کے زیر اثر۔ کبھی محل احتمال ہے
کبھی محل اتباع۔ اور مناسبت لفظی کے زیر اثر کبھی محل اشتقاق ہے کبھی
محل تصریف، کبھی محل توازن۔ اور توازن ہیئت کے زیر اثر محل تنظیم ہے
یہ کل محل استعمال آٹھ ہوئے۔ ان میں بعض کا اقتضائے حال تابعیت جنس
ہے اور بعض کا اقتضا مساوات حال[2]۔

فقدان جنسیت کے وقت جو محل تابعیت میں نہ رہے گا

[1] متکلم کے مفہوم کو سامع کے ذہن تک پہنچانا۔

[2] کسی محل کا اقتضا یہ ہوتا ہے کہ ہم جنس الفاظ استعمال کیے جائیں اور کسی کا یہ کہ ایسے الفاظ لائے جائیں جو حالت اعتدال میں برابر یا صورت میں مشابہ ہوں یا ایسے مرکبات لائے جائیں جو ہیئت ترکیبی میں یکساں ہوں۔

وہ محل فقدان[1] کہا جائیگا اور فقدان مترادفات کے وقت منفرد غیر جنس
کی مداخلت سے محل مستقل محل انقطاع[2] سمجھا جائیگا۔ اب محل استعمال دس ہوگئے
تشریح ہر محل کی دلالت استعمال کے تحت میں بیان ہوگی۔

دلالتِ استعمال

دلالت استعمال اُس وجہ دلیل کا نام ہے جو لفظ کے استعمال بر محل کا تعین
ثبوت اور موانست باہمی کے لیے کافی ضمانت ہو سکے۔ دلالت معنوی
بھی ہوتی ہے لفظی بھی۔ دلالت معنوی منفردات کے لیے کافی ہے[3]۔ مگر
مترادفات کے لیے کافی نہیں کہ وہ باعتبار معنی تو ایک محل پر جچتے ہوں اب

[1] اگر محل کا اقتضا یہ ہو کہ ایسا لفظ لایا جائے جو کسی دوسرے لفظ کا ہم جنس ہو لیکن زبان میں ایسا کوئی لفظ موجود نہ ہو تو مجبوراً لفظ غیر جنس استعمال کرینگے۔ اب اگر یہ غیر جنس لفظ مترادفات میں سے ہے تو اس کے محل استعمال کو محل فقدان کہیں گے۔ اور اگر لفظ منفرد ہے تو محل انقطاع کہیں گے۔

[3] الفاظ منفرد کے استعمال میں صرف یہ دیکھنا کافی ہے کہ معنی مقصود کے ادا ہوتے ہیں یا نہیں اگر ادا ہو رہے ہیں تو انکا استعمال برمحل ہے۔

مطابقت تامّ ہے جو محتاج دلالت[1] نہیں اور اگر ایک حیثیت میں اتفاق اور دوسری حیثیت میں اختلاف ہو تو اقتضائے حال پر نظر کر کے جب مطابقت جنس سے لفظ کو اختیار کرینگے تو وجہ ترجیح کو دلالت جنسی کہینگے اور جب مطابقت حال[2] سے اختیار کرینگے تو دلالت حالی کہینگے۔ بس یہی دو دلالتیں اور سات مناسبتیں اُصول موافقت کی بنیادیں ہیں جن پر تمام مفردات و مرکبات کے استعمال برمحل کا دار و مدار ہے۔

دلالتوں کے محل[3] دخل و محل عجز

دلالت حالی وہ دلالت استعمال لفظ ہے جس کے زیر اثر دو کا

[1] اگر کسی جملہ میں ایسے الفاظ جمع ہو جائیں کہ سب کے سب ہم جنس بھی ہوں اور متماثل بھی ہوں تو ان میں موافقت کی صفت کمال کی حد تک موجود ہوگی اور ان کے استعمال کیلیے کسی دلیل کی ضرورت نہ ہوگی۔ مصنف نے یہاں دلالت سے دلالت لفظی مراد لی ہے۔

[2] یعنی درجہ اعتدال میں برابر ہونا یا صورت میں مشابہ ہونا یا ہیئت ترکیبی میں یکسان ہونا۔

[3] جن مقامات پر لفظ کا استعمال کسی خاص دلالت کے تحت میں ہوتا ہے وہ اس دلالت کے محل دخل ہیں اور جو مقامات اس دلالت کے تحت میں نہیں آتے وہ اسکے لیے محل عجز ہیں۔

ایک ہی کے حکم میں ہیں۔ لہٰذا ان میں ترک و اختیار کا فیصلہ دلالت لفظی پر موقوف[1] ہے۔

دلیل موافقت مطابقت باہمی ہے۔ خواہ حالت لفظ کے اعتبار سے ہو یا جنس لفظ کے لحاظ[2] سے۔ اگر کسی طرح کا اختلاف نہ ہوا تو

[1] مترادفات کے استعمال میں بھی پہلی چیز دلالت معنوی ہے یعنی یہ کہ وہ معنی مقصود کو بخوبی ادا کرتے ہوں۔ بعض لفظ ایسے ہیں کہ فی الجملہ مترادف کہے جا سکتے ہیں لیکن اُن کے معنوں میں نازک فرق ہیں مثلاً بدلی اور گھٹا ان فرقوں کا لحاظ کر کے کسی لفظ کو اختیار کرنا بھی دلالت معنوی کے تحت میں آتا ہے لیکن ایسے الفاظ بھی ہیں جو ہر حیثیت سے بالکل ہم معنی ہیں مثلاً شب اور رات، روز اور دن، پروانہ اور پتنگا، گود اور آغوش۔ اظہار معنی کے لحاظ سے شب کا لفظ اگر کسی محل پر مناسب ہے تو رات کا لفظ بھی اتنا ہی موزوں ہوگا۔ لیکن فصاحت کلام کے لحاظ سے کسی محل پر شب زیادہ مناسب ہوگا کسی محل پر رات۔ یعنی مترادفات کے استعمال برمحل کے لیے لفظ کے معنی کے علاوہ انکی صوری خصوصیتوں کا بھی لحاظ کرنا ہوتا ہے۔

[2] لفظوں میں موافقت دو طرح پیدا ہوتی ہے ایک اس طرح کہ سب لفظ ایک ہی جنس کے ہوں دوسرے اس طرح کہ سب کی حالت یکساں ہو یعنی درجہ اعتدال میں برابر یا صورت میں مشابہ یا ہیئت ترکیبی میں یکساں ہوں۔

دائرہ اعتدال تزئین کے ساتھ قائم ہوتا ہے محل دخل اسکا وہ ہے کہ تابعیت جنس سے خالی ہو یا اتحاد جنس کا امکان نہ ہو[1]۔ ایسے محل چار ہیں محل[2] عدل محل[3] فقدان۔ محل[4] توازن۔ محل[5] تنظیم۔

دلالت جنسی وہ دلالت استعمال لفظ ہے جس کے زیر اثر اردو زبان کا دائرہ تزئین وسیع ہوتا ہے محل دخل اسکا وہ ہے کہ یا تو لفظ فقص اعتدال سے وساطت کا محتاج ہو[6]۔ یا اقتضائے حال سے تابعیت جنس

---

[1] یعنی سوا ان چند مقامات کے جہاں الفاظ مجنس کا لانا بہتر ہے ہر جگہ مترادفات میں سے اس لفظ کو ترجیح دینا چاہیے جو سب سے زیادہ معتدل ہے۔ اگر کسی جگہ لفظ مجنس لانا مناسب ہو لیکن زبان میں ایسا لفظ موجود نہ ہو تو بھی مترادفات میں سے وہی لفظ اختیار کیا جائیگا جو سب سے زیادہ معتدل ہوگا۔

[2] الفاظ غیر معتدل صرف اس وقت فصیح معلوم ہوتے ہیں جب وہ اپنے مجنس الفاظ کے ساتھ ترکیب دیکر استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً اسپ صبا رفتار پر سوار فصیح اور اسپ پر سوار غیر فصیح ہے۔ حوت، شجر، اسپ، فیل، برق، باد، آب، آتش، گل، عندلیب، گنج، مار، سیم، زر، آہن، اشک، چشم وغیرہ اسی قبیل کے الفاظ ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ نظم میں وزن اور قافیہ کی قیدوں سے اکثر اصول فصاحت سے تجاوز کرنا پڑتا ہے اور نظم کی موزونیت اور ترنم سے اسکی تلافی ہوجاتی ہے مثلاً ؎ شب وصل کیا مختصر ہوگئی ۔ ذرا آنکھ جھپکی سحر ہوگئی (بقیہ دو صفحہ پر)

میں ہو[1]۔ ایسے محل چار ہیں۔ (۱) محل اشتمال (۲) محل اتباع (۳) محل اشتقاق (۴) محل تصریف۔

محل تنظیم دونوں دلالتوں کے لیے مشترک ہے[2]۔ باقی ہر محل کسی ایک

(بقیہ دو صفحہ گزشتہ) ؎ آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں ۔ تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

مجھ کو رونا دیکھ کر وہ ہنس دیا	برق چمکی ابر باراں تھم رہا
گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی	اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی
صحبت اہل فنا سے تیرہ دل کب جائے زنگ	زنگ آلودہ ہوجاتا ہے آہن آب میں

مگر نثر میں یہ قیدیں نہیں ہوتیں اس لیے نظم میں کسی لفظ غیر معتدل کو اقرار استعمال ہوتے ہوئے دیکھ کر نثر میں اس کا استعمال جائز سمجھنا غلطی ہے۔

[1] بعض محل ایسے ہیں جہاں مجنس الفاظ لانے سے کلام کی فصاحت بڑھ جاتی ہے لیکن ایسے محلوں میں بھی لفظ کا معتدل ہونا ضروری ہے صرف اتنا ہے کہ معتدل مجنس کو معتدل غیر جنس پر ترجیح ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اگر مترادفات میں سے ایک ہم جنس اور دوسرا غیر جنس ہو اور مترادف مجنس درجہ اعتدال میں مترادف غیر جنس سے کم ہو تو بھی اسی کو اختیار کریں۔

[2] محل تنظیم میں دو مرکب یا دو فقرے یا جملے ایسے لانا ہوتے ہیں جنکی ساخت یکساں ہو کبھی یہ حالت الفاظ مجنس لانے سے پیدا ہوتی ہے کبھی محض الفاظ معتدل لانے سے اس لیے مصنف نے محل تنظیم کو دلالت حالی و دلالت جنسی دونوں کا محل دخل کہا ہے۔

دلالت سے مختص ہے۔

تشریحات محل استعمال مع دلالت استعمال

محل مستقل[1] لفظ منفرد کے محل استعمال کا نام ہے جو صرف دلالت معنوی کا محل دخل ہے۔ مثلاً اس فقرہ میں "انتظار حد سے گزرا" "اعتبار جاتا رہا" یہاں انتظار و اعتبار قسم منفرد سے ہیں کہ ان کا ہم معنے کوئی لفظ اردو میں نہیں۔ اسلیے انکا استعمال بھی کسی دلالت لفظی کا محتاج نہیں۔

محل اعتدال۔ وہ جگہ ہے جہان مترادفات کسی مناسبت کے ساتھ قبول اثر میں نہوں[1]۔ یہان کا اقتضائے حال ترجیح درجہ اعتدال ہے اور وہی دلالت حالی کے لیے حق مداخلت کی تائید کرتا ہے۔ لہذا اصول عام کے پہلے قاعدے کی رو سے جو مترادف معتدل تر ہے وہی فصیح تر بھی ہے مثلاً بادل ابر سے اور ابر سحاب سے درجہ اعتدال میں زیادہ ہے۔ لہذا ابر آیا فصیح ہے تو بادل آیا فصیح تر ہے اور سحاب آیا غیر فصیح ہے اسلیے کہ سحاب غیر معتدل ہے جس کا محل صرف نادر ہے۔ مگر جب مترادفات درجہ اعتدال

[1] یعنی جہان لفظوں میں کوئی ایسی مناسبت موجود نہو جسکا اقتضا ماہیت جنس ہو۔

میں برابر ہوں تو اصولاً ہر ایک کا استعمال درست ہے مثلاً "قسمت اچھی" "نصیب اچھا"۔ "تقدیر اچھی" "مقدر اچھا" ہر طرح فصیح ہے۔ یہ دونوں محل مذکور صرف جائے آغاز مناسبات ہیں[1]۔

محل اشتمال۔ ربط معنی کی وہ جگہ اور قبول اثر کا وہ محل ہے جہاں منسوب منسوب الیہ کے ساتھ کسی حیثیت سے شامل ہو اگر یہ اشتمال منسوب الیہ کی ذات سے ہوگا تو اشتمال ذاتی کہا جائیگا۔ اور حالت سے ہوگا تو اشتمال حالی سمجھا جائیگا۔ اقتضا اس محل کا اتحاد جنس ہے۔ لہذا اسے دلالت جنسی کا محل دخل سمجھنا چاہیے۔

اشتمال ذاتی جیسے "لہو کی بوند۔ خون کا قطرہ۔ یا خون کی سرخی۔ لہو کی لالی"[2]۔ اگرچہ توازن اعتدال کے لحاظ سے خون کی بوند اور لہو کا قطرہ بولنا بھی غیر فصیح نہوگا[3] لیکن پہلی صورت فصیح تر ہے کہ توازن اعتدالی کے ساتھ

[1] محل مستقل یا محل اعتدال میں جو لفظ آئے گا۔ اس کی مناسبت سے بعد کے الفاظ لائے جائیں گے۔

[2] قطرہ یا بوند اور سرخی یا لالی کا مفہوم خون یا لہو کے مفہوم میں شامل ہے۔

[3] اسلیے کہ خون اور لہو۔ قطرہ اور بوند درجہ اعتدال میں برابر ہیں۔

اتحادِ جنس بھی موجود ہے۔ اس جگہ منسوبات[1] کو نیم تابعیت میں سمجھنا چاہیے[2]

اشتمال حالی جیسے کہیں۔ "یہ پھل کڑوا ہے اور وہ کسیلا ہے۔ اس کا رنگ نیلا ہے اور اس کا رنگ کالا ہے" تو فصیح ہے۔ اور اگر کہیں "یہ پھل تلخ ہے وہ کسیلا ہے۔ یا یہ نیلا ہے اور وہ سیاہ ہے" تو فصیح نہ ہوگا کہ اسما صفات میں بھی زیادہ موانست اتحادِ جنسی ہے۔ یہ حیثیتیں بہت ہیں مثالاً دو تین ذکر کر دی گئیں۔

محلِ اتباع وہ جائے ربطِ معنی ہے جہاں مترادفات نسبتِ تقابل کے زیرِ اثر ہوں[3]۔ اس محل کا اقتضا بھی اتحادِ جنس ہے جس سے دلالتِ جنسی کا حق داخلت ظاہر ہے۔ دیکھو کہ گرمی کے ساتھ سردی بولنا فصیح اور ٹھنڈک بولنا غیر فصیح[4] ہے۔ یا ٹھنڈک کے ساتھ جلن بولنا فصیح اور

[1] یعنی وہ الفاظ جن میں باہم کسی طرح کی نسبت ہو

[2] محلِ اشتمال میں فصاحتِ کلام کے لیے لفظوں کا ہم جنس ہونا ضروری تو نہیں ہے پھر بھی ان کے ہم جنس ہونے سے فصاحت بڑھ جاتی ہے لہٰذا اگر الفاظ جنسیت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے تابع ہوں تو بہتر ہے۔

[3] یعنی جہاں ایسے الفاظ لانا ہوں جو معناً ایک دوسرے کی ضد یا مخالف ہوں۔

[4] گرمی لفظ مفرد ہے اگرچہ حرارت، اسکا مترادف موجود ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

سوزش بولنا غیر فصیح[1] ہے۔ اس جگہ تابعیت کے لیے ترتیب شرط نہیں، نسبت شرط ہے۔ مترادف پہلے ہو یا بعد ہر جگہ منفرد کی تابعیت میں ہے دیکھو کہ جس طرح گرمی سردی بولنے میں فصیح ہے اسی طرح سردی گرمی بھی فصیح ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب محلِ تابعیت جنس کا ہو اور لفظ ہم جنس ممکن نہ ہو تو داخلِ جنس۔ شاملِ جنس شریکِ جنس میں سے جو لفظ مل جائے اسے بھی غیر جنس پر ترجیح ہے۔ مثلاً اس جملہ میں "دشمن کی شکست کے معنی یہی کہ ہماری فتح ہوئی" "فتح اور شکست" نسبتِ تقابل کے زیرِ اثر محلِ اتباع

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لیکن اردو میں اس لفظ کا استعمال ہلکے بخار کے معنی میں ہوتا ہے اسی طرح گرم کا مترادف "حار" موجود ہے لیکن اردو میں یہ ایک طبی اصطلاح کی حیثیت رکھتا ہے۔

[1] اس قاعدے کی رو سے "فتح کے ساتھ شکست" اور "جیت کے ساتھ ہار" لانا فصیح ہوگا اور اسکے خلاف غیر فصیح۔ مثلاً "جب دو بادشاہ لڑتے ہیں تو ایک کی فتح ہوتی ہے دوسرے کی شکست" یا "ایک کی جیت ہوتی ہے دوسرے کی ہار" دونوں طرح فصیح ہے۔ لیکن "ایک کی فتح ہوتی ہے دوسرے کی ہار" یا "ایک کی جیت ہوتی ہے دوسرے کی شکست" دونوں طرح غیر فصیح ہے۔

میں ہیں۔ لیکن دونوں میں سے کسی کا مترادف ہمجنس اُردو میں موجود نہیں
اور فتح جو عربی لفظ ہے شکست کے ساتھ جو فارسی ہے شامل جنس ہے لہذا
محل استعمال لفظ محل اتباع ہی رہے گا اور دلالت جنسی کا محل دخل مانا
جائیگا۔ اور اگر مذکورہ بالا تینوں قسموں میں سے کسی قسم کا کوئی لفظ نظر
نہ آئیگا تو فقدان جنسیت سمجھا جائیگا اور محل اتباع محل فقدان کے نام سے
موسوم ہو کر دلالت حالی کا محل دخل بنجائے گا۔

محل فقدان وہ محل ہے جہاں تابعیت جنس لازم ہو لیکن اتحاد جنس
کا امکان نہو۔ ایسی حالت میں جو مترادف درجہ اعتدال میں اپنے منسوب الیہ[1]
سے برابر ہوگا وہی لائق استعمال سمجھا جائیگا۔ مثلاً "درخت کی شاخ سوکھ
گئی۔ پتے مرجھا گئے۔ پھول کمھلا گئے" یہاں درخت محل اعتدال میں۔
شاخ محل اشتمال میں۔ پتے محل فقدان میں ہیں[2]۔

---

[1] جس لفظ سے کسی دوسرے لفظ کو نسبت ہو۔
[2] درخت، شاخ، پتے ان لفظوں میں نسبت اشتمال ہے۔ اسلئے ان میں اتحاد جنس
ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن پتے کا مترادف کوئی لفظ متعدل اُردو میں موجود نہیں ہے اسلئے
باوجود اسکے کہ وہ 'درخت' اور 'شاخ' کا ہمجنس نہیں ہے اُسی کو استعمال کرنا پڑا۔

محل اشتقاق۔ وہ جگہ ہے جہاں مشتقات کا ماخذ معنوی حیثیت سے
یکساں ہو[1]۔ اقتضائے حال اس جگہ کا اشتراک مادی ہے[2] مثلاً "قاتل سے
مقتول کا قصاص لیا" فصیح ہے لیکن اگر کہیں کہ "قاتل سے کشتہ کا قصاص
لیا" یا "قتل کرنے والے سے مقتول کا قصاص لیا" تو غیر فصیح ہو جائیگا۔
محل تصریف۔ وہ جگہ ہے جہاں اصطلاح صرف میں الفاظ ایک ہی نام
کے ہوں۔ اقتضائے حال اس کا یہ ہے کہ ساخت دونوں کی ایک ہی قاعدے
کے ماتحت ہو جیسے افہام۔ تفہیم دونوں مصدر ہیں یا مکرم۔ محترم دونوں
اسم مفعول یا مساجد۔ مقابر دونوں میں علامت جمع عربی کی ہے۔ ان
میں سے جس کی ساخت دوسرے مادے یا قاعدے سے ہو گی تو ان
باہمی میں فرق اگر غیر مانوس ہو جائیگا مثلاً تفہیم کی جگہ سمجھانا۔ یا محترم
کی جگہ احترام کیا گیا۔ یا بزرگی یافتہ بولیں تو غیر فصیح ہو جائیگا۔ اسی طرح

---

[1] مثلاً مقتول، کشتہ، مردہ، میں مادہ لفظ کا مفہوم مشترک ہے جس مقام پر اس طرح کے
کئی لفظ لانا ہوں اس کو مصنف نے محل اشتقاق کہا ہے۔
[2] محل اشتقاق میں جو لفظ آئیں اُن کو ایک ہی مادے سے مشتق ہونا چاہیئے
ورنہ کلام فصیح نہ ہوگا۔

اگر علامت جمع بھی بدل دیں اور یوں کہیں کہ مسجدیں آباد ہیں اور مقابر ویران ہیں۔ یا مساجد آباد ہیں مقبرے ویران ہیں تو کسی طرح فصیح نہ ہوگا۔

محل توازن:۔ وہ جگہ ہے جہاں ایک لفظ دوسرے کا ہم وزن یا ہم قافیہ ہو۔ اگر ہم وزن بھی ہو اور ہم قافیہ بھی تو توازن تام ہے جیسے کہیں کہ "ہوش آیا جوش گیا" اور اگر صرف ہم وزن ہے جیسے کہیں کہ "نہ کوئی کام ہے نہ کاج" یا صرف ہم قافیہ ہے جیسے کہیں کہ "نہ وہ جوش ہے نہ خروش ہے" تو توازن ناقص ہے۔ بہر نوع توازن تام ہو یا ناقص دونوں محمول فصاحت ہیں۔

اور اگر توازن تام کے ساتھ اتحاد جنس کا بھی لحاظ کر لیا جائے تو دائرہ زبان کا بیرونی لفظ بھی جو یوں مانوس نہیں مانوس ہو جائیگا جیسے کہیں کہ "اگر بیت کی ریت سمجھو تو مان کا پان بہت ہے" یہاں دونوں فقرے یکساں فصیح معلوم ہوتے ہیں حالانکہ بیت انفراداً اردو میں دخیل نہیں[1]

---

[1] خاکسار مُنشی نے اپنے ذوق کے فیصلے سے ایک جگہ "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" کا ترجمہ کر کے "نہ چلنے کو پاؤں نہ بیٹھنے کو ٹھاؤں" لکھ دیا تھا۔ (دبستان اردو صفحہ) ٹھاؤں کا لفظ جگہ کے معنی میں (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

محل انقطاع:۔ وہ جگہ ہے جہاں ربط کلام میں کوئی مترادف نظر نہ آتا ہو تو استعمال لفظ منفرد لازمی ہوگا لہذا قسم لفظ بدل جانے سے تابعیت دور ہو کر کسی دلالت لفظی کا محل و دخل نہ رہے گا[1]۔ اب منفرد کے لیے دو حالتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بحیثیت جنس وہ اپنے ماقبل کے موافق ہو جیسے کہیں کہ "سینہ چوڑا ہے۔ کمر پتلی ہے" تو سینہ و کمر میں اتحاد جنس اتفاقی ہے[2] لہذا نسبت قطع نہ ہوگی اور محل استعمال محل مستقل ہی کہا جائے گا۔

---

[1] اگر جملے میں کسی محل پر ایسا لفظ لانا ہے جس کو اصول فصاحت کے اعتبار سے اپنے سے پہلے کے کسی لفظ کا ہم جنس ہونا چاہیے۔ لیکن زبان میں اس محل پر صرف کرنے کے قابل صرف ایک ہی لفظ موجود ہو تو ظاہر ہے کہ وہی لفظ لانا پڑے گا خواہ وہ لفظ متعلق کا ہم جنس ہو یا نہ ہو۔ اگر وہ لفظ غیر جنس ہوگا تو اسکے محل استعمال کو محل انقطاع کہیں گے۔ کیونکہ اُس میں اور اُس سے معنوی تعلق رکھنے والے لفظ میں کوئی لفظی نسبت نہ ہوگی۔

[2] مثال کے جملہ میں "سینہ اور کمر" میں نسبت اشتمال حال ہے اسلیے اصول معینہ کی رو سے ان دونوں کو ہم جنس ہونا چاہیے تھا۔ مگر لفظ منفرد ہے اسلیے اُسکا استعمال ناگزیر تھا۔ محض اتفاق ہے کہ لفظ "کمر" لفظ "سینہ" کا ہم جنس ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ متعدد مترادفات میں سے "کمر" کا لفظ اسلیے اختیار کیا گیا ہے کہ وہ "سینہ" کا ہم جنس ہے۔

دوسرے یہ کہ منفرد حیثیت جنس مخالف ماقبل ہو جیسے کہیں "کہ گردن ٹیڑھی ہے ہاتھ سیدھا ہے" اب نسبت قطع ہو جائے گی کہ گردن اور ہاتھ میں اختلاف جنس ہے لہٰذا تام محلِ استعمال کا محل انقطاع ہوگا جو مناسبات کے دوسرے سلسلہ کے لیے محل آغاز سمجھا جائیگا جس سے محل اتباع بھی مستثنیٰ نہیں۔

[1] ماقبل سے یہاں مراد لفظ زیرِ بحث سے پہلے کا وہ لفظ جس سے وہ کسی طرح کی نسبت رکھتا ہو۔

[2] دیکھو حاشیہ نمبر (۱) صفحہ (۸۰)

[3] یعنی جو لفظ محل انقطاع میں واقع ہوگا اس کو اپنے سے پہلے کے لفظوں سے کوئی لفظی نسبت نہ ہوگی لیکن اس کے بعد کا لفظ بشرط امکان اسکی مناسبت سے لایا جائیگا

[4] اس جملے میں مابعد سے مراد ہے کسی لفظ کے بعد کا وہ لفظ جس سے وہ کسی طرح کی نسبت رکھتا ہو خواہ وہ اس کے بعد کا پہلا لفظ ہو یا کئی لفظوں کے بعد واقع ہو مثلاً گرمی نے بہت جی جلایا تھا سردی سے ذرا کلیجے میں ٹھنڈک پڑی"۔ اس جملے میں "گرمی" کو "سردی" سے نسبت تقابل ہے۔ اس لیے سردی کا لفظ محل اتباع میں ہے جس کا مقتضا یہ ہے کہ وہ "گرمی" کا ہم جنس ہو۔ یہاں لفظ گرمی کی مناسبت جس لفظ میں ملحوظ رکھی گئی ہے وہ اس کے بعد کا پہلا لفظ نہیں ہے بلکہ کئی لفظوں کے بعد آیا ہے۔

محلِ تنظیم۔ وہ جگہ ہے جو ہیئت ترکیبی کے زیر اثر ہو۔ اقتضا اس محل کا صرف توازن ہیئت ہے۔ مثلاً کہیں کہ "یہ بات دلپذیر ہے مگر دیر گیر ہے' یا 'وہ امر جان و دل سے قبول نہیں کہ دین و ایمان کے خلاف ہے" تو توازن موجود ہے۔ بر خلاف اس کے اگر یوں کہیں کہ "یہ بات دل کو پسند ہے مگر دیر گیر ہے' یا یوں کہ 'یہ بات دلپذیر ہے مگر دیر میں ہونیوالی ہے" تو جتنا توازن میں فرق آیا اتنا ہی فصاحت کلام میں فرق آگیا۔ اسی طرح دوسرے فقرے میں بھی مثلاً کہیں کہ "وہ امر جان و دل سے قبول نہیں کہ دین و ایمان کے خلاف ہے" یا بالعکس بولیں تو کسی طرح فصیح[1] نہوگا۔ یہی حالت معاملات ہندی کی ہے مثلاً گرجتی بجلی، گرجتا بادل،

[1] اگر ہیئت ترکیبی کے یکساں ہونے کے ساتھ مرکبات کے ابتدائی یا آخری الفاظ ہمقافیہ بھی ہوں تو کلام کا حسن اور بڑھ جاتا ہے اس مثال میں "جان و دل" اور "دین و ایمان" دونوں کی ہیئت ترکیبی یکساں ہے کیونکہ دونوں فارسی کے مرکب عطفی ہیں۔ اگر پہلے مرکب کے اجزائے ترکیبی کی جگہ بدل دیں اور "دل و جاں" کہیں تو اس مرکب کا استعمال "دین و ایمان" کے ساتھ اور بھی زیادہ اچھا معلوم ہوگا۔ یہ مثال تو ہوئی مرکبات کے آخری لفظوں کے ہمقافیہ ہونے کی۔ ابتدائی الفاظ کے ہمقافیہ ہونے سے کلام میں جو حسن پیدا ہوتا ہے اسکی مثال یہ ہے۔ "انکو 'بخت' سا نے 'تخت سلطنت' پر بٹھا دیا"۔

یا کڑکتی ہوئی بجلی، گرجتا ہوا بادل" ایک دوسرے کے ساتھ فصیح معلوم
ہوتے ہیں۔ برخلاف اسکے "کڑکتی ہوئی بجلی گرجتا بادل" یا "کڑکتی بجلی
گرجتا ہوا بادل" بولیں تو ہرگز فصیح نہ ہوگا کہ فرق توازن مخل فصاحت ہے
توازن ہیئت کے ساتھ اگر پورے پورے فقرے اور جملے بنا کر استعمال کیے
جائیں تو فصاحت بڑھتی چلی جائیگی۔ مثلاً "آنکھوں کی کھڑکیاں کھلی ہوئی
ہیں، کانوں کے منھ کھچے پڑے ہیں، وہ دیکھتا ہے مگر سنتا ایک نہیں[1]"
توازن ہیئت میں ہیئت ترکیبی جس دلالت کی حامی ہوگی وہی دلالت استعمال
سمجھی جائے گی۔

[1] وضاحت کے لیے دو مثالیں اور دی جاتی ہیں "وہ ہنستا ہوا آیا اور روتا ہوا
گیا" یا "وہ آیا ہنستا ہوا اور گیا روتا ہوا" دونوں طرح فصیح ہے لیکن "وہ آیا ہنستا ہوا
اور روتا ہوا گیا" فصیح نہیں۔ اسی طرح "یہ ان سے مستفید ہوتے ہیں اور وہ ان سے
مستفیض" یا "یہ اُن سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور وہ اُن سے فیض پاتے ہیں" دونوں
طرح نہایت فصیح ہے لیکن "یہ اُن سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور وہ ان سے مستفیض ہوتے
ہیں" اتنا فصیح نہیں۔

خاتمہ

اصول مذکور کلیۃً نثر سے متعلق ہیں مگر نظم میں بھی جہاں تک وزن عروض
اور قید قافیہ مجبور نہ کرے پابندی اصول عین فصاحت ہے[1] کیونکہ ہر قاعدہ
جاری کرنے کے لیے امکان شرط ہے اور نظم میں پابندی اوزان سب پر
مقدم ہے اس میں ایسے فصیح البیان نے روانی و چستگی قائم رکھنے کی غرض سے
غیر معتدل الفاظ ترکیب ہندی کے ساتھ بے تکلف استعمال کیے ہیں اور
حسن نظم نے انھیں بھی فصیح کر دکھایا ہے مثلاً ع "نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے"

[1] میرا خیال ہے کہ اگر دو قاعدے اور بڑھا دیے جائیں ایک خاص اور ایک عام
تو یہ اصول نظم پر بھی اُتنے ہی حاوی ہو جائیں جتنے نثر پر ہیں۔ خاص قاعدہ یہ ہے کہ
نظم میں الفاظ غیر معتدل کا استعمال صرف اس صورت میں جائز ہے کہ وہ اپنے ہم جنس الفاظ
سے ترکیب پا کر آئے ہوں۔ نظم میں اسکے علاوہ جواز کی دو صورتیں اور بھی ہیں۔ ایک تو
جہاں اُن سے توازن ہیئت کا قاعدہ حاصل ہوتا ہو دوسرے وہ کہ الفاظ محل اتباع میں
واقع ہوں یعنی مقتضائے مقام یہ ہو کہ الفاظ ہم جنس استعمال کیے جائیں۔ عام قاعدہ یہ
ہے کہ نظم میں اصول فصاحت سے تجاوز اس حد تک جائز ہے کہ کلام کی روانی اور ترنم
یا شعر کی کوئی دوسری خوبی اس نقص کا نعم البدل ہو جائے۔

اس مصرع میں ضیغم غیر متعدل ہے مگر فصیح معلوم ہوتا ہے۔ اگر یوں کہیں کہ
ع "شیر اک ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے" تو وہ روانی پیدا نہیں ہوتی جس سے
فصیح لفظ (شیر) غیر فصیح ہو گیا اور وزن بحر پورا کرنے کے لیے (اک) بڑھانا
پڑا جو درحقیقت حشو ہے۔ اگر لفظ شیر کو اسی مضمون کے ساتھ کسی ایسی بحر
میں نظم کیا جائے جو اس لفظ کے مناسب حال ہو تو یہ بھی فصیح معلوم ہوگا
مثلاً ع "چلا کچھار سے جھک کر ڈکارتا ہوا شیر" یہاں شیر بھی اتنا ہی فصیح ہے
جتنا وہاں ضیغم فصیح ہے۔

دوسری جگہ اوس کے بدلے شبنم استعمال کیا ہے۔ ع شبنم نے
بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے" یہاں شبنم کا استعمال بھی ایسا نہیں کہ
اس کی جگہ اوس فصیح نہ معلوم ہو۔ شاعر کا مقصد پہلی فکر میں جس لفظ سے
حاصل ہو گیا اوس نے اسی پر اکتفا کی ورنہ اگر یوں کہا جاتا "ع چھلکا رہی
تھی اوس کٹورے گلاب کے" تو بھی فصیح بلکہ فصیح تر ہوتا۔ مگر ہاں ایک اور
جگہ اوس جس طرح استعمال کیا ہے وہاں شبنم کا استعمال صرف مخل فصاحت
نہیں بلکہ غلط ہو جائیگا۔ ع کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا"
یہاں "اوس کھانا" کا استعمال مقرر اور سماعی ہے جسے اصطلاح عام میں

محاورہ کہتے ہیں لہذا اگر یہاں اوس کی جگہ شبنم استعمال کیا جائیگا تو خلاف
محاورہ ہو جائے گا اسلیے کھا کھا کے شبنم" سامعہ خراش معلوم ہوتا ہے

ضرورت قافیہ سے بھی غیر متعدل الفاظ اصول فصاحت کے خلاف
استعمال میں آیا کرتے ہیں۔ مثلاً سر کے ساتھ مجر، گلشن کے ساتھ گلخن، نمود
بود کے ساتھ دود" غرضکہ صدہا غیر متعمل الفاظ بغیر ترکیب فارسی کے
مستند شعرا کے کلام میں موجود ہیں۔ اور غیر فصیح بھی نہیں معلوم ہوتے کیونکہ
ان میں بھی نسبت توازن موجود ہے اگرچہ فاصلۂ بعید کے ساتھ ہے ۱۲

اس محل پر یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کا ہے کہ جب ایک عیب مٹانے سے
دوسرا عیب پیدا ہوتا ہو اور دونوں سے بچنا محال ہو تو مدارج عیوب
پر نظر کرکے فیصلہ کر لینا چاہیے جیسا کہ پہلی مثال سے واضح ہے۔

مطبوعات اترپردیش اردو اکاڈمی

۱۔ انیسیات: سید مسعود حسن رضوی ادیب ۱۲/۵۰

۲۔ بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں: مرزا جعفر حسین ۱۸/-

۳۔ قصیدہ نگاران اترپردیش: سید علی جواد زیدی ۱۸/۷۵

۴۔ مونا وانا (ڈراما) مترجمہ اے۔ این سپرو ۶/۵۰

۵۔ روح نظیر (فوٹو آفسیٹ ایڈیشن) مخمور اکبرآبادی ۲۰/۷۵

۶۔ مراۃ الشعر (فوٹو آفسیٹ ایڈیشن): عبدالرحمٰن ۱۳/۷۵

۷۔ تنویر الشمس (فوٹو آفسیٹ ایڈیشن): اعجاز رقم شمس الدین ۳/-

۸۔ انتخاب منظومات (حصہ اول): (بی۔اے کے نصاب کے مطابق) ۳/-

۹۔ انتخاب منظومات (حصہ دوم): (" ") ۳/۷۵

۱۰۔ مطالعہ اقبال: (اقبال سیمینار میں پڑھے گئے مقالات) ۵/۲۵

۱۱۔ وجودیت پر ایک تنقیدی نظر: سلطان علی شیدا ۱/۲۰

۱۲۔ ادب کے نوبل انعام یافتگان: شری مراری سنہا ۷/۶۵

۱۳۔ انتخاب افسانہ: (برائے بی۔اے) ۶/۵۰

۱۴۔ جدید ادب: منظر اور پس منظر: سید احتشام حسین ۹/۵۰

۱۵۔ انتخاب نثر (حصہ اول) (برائے بی۔اے) ۳/-

۱۶۔ انتخاب نثر (حصہ دوم) (" ") ۳/-

۱۷۔ بکٹ کہانی (افضل) مرتبہ، نورالحسن ہاشمی و مسعود حسین خاں ۲/۶۰

۱۸۔ انتخاب قصائد: ڈاکٹر حکم چند نیر ۲/۶۲

۱۹۔ سیاسی نظریے: ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۲/۲۰

۲۰۔ لالۂ شاداب: (مجموعۂ کلام) مسعود اختر جمال ۵/۱۵

۲۱۔ سخن دان فارس (فوٹو آفسیٹ ایڈیشن) محمد حسین آزاد ۱۲/۵۰

۲۲۔ گنجینۂ تحقیق (") سید احمد محمود موہانی ۱۰/۵۰

۲۳۔ نظام اردو (") سید انور حسین آرزو ۳/۱۵

۲۴۔ سریلی بانسری (") " ۵/۱۵

۲۵۔ جہان آرزو (") " ۶/۸۰

۲۶۔ رباعیات انیس (") ۴/۱۰

۱۵۔ انتخاب نثر (حصہ اول) (برائے بی۔ اے) ۳/-

۱۶۔ انتخاب نثر (حصہ دوم) (” ”) ۳/-

۱۷۔ بکٹ کہانی (افضل) مرتبہ: نورالحسن ہاشمی و مسعود حسین خاں ۲/۶۰

۱۸۔ انتخاب قصائد: ڈاکٹر حکم چند نیر ۲/۶۲

۱۹۔ سیاسی نظریے: ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۲/۲۰

۲۰۔ لالۂ شاداب: (مجموعۂ کلام) مسعود اختر جمال ۵/۱۵

۲۱۔ سخن دان فارس (فوٹو آفسیٹ ایڈیشن) محمد حسین آزاد ۱۲/۵۰

۲۲۔ گنجینۂ تحقیق (”) سید احمد محمود موہانی ۱۰/۵۰

۲۳۔ نظام اردو (”) سید انور حسین آرزو ۳/۱۵

۲۴۔ سُریلی بانسری (”) ” ۵/۱۵

۲۵۔ جہانِ آرزو (”) ” ۶/۸۰

۲۶۔ رباعیاتِ انیس (”) ۴/۱۰

شمس الرحمٰن فاروقی

نومبر ۱۹۸۵

عروض سیفی

از سیفی شیرازی

[illegible]

[illegible]

۸۹۶ ۔ ۔ ۔

تاریخ طبع ۱۸۹۶ عیسوی